قائداعظم

قائداعظم اکادمی
کراچی

سند

یہ کتاب بطور انعام اوّل مقابلہ ذہنی آزمائش ملی نغمات منعقدہ ۲۳ مارچ ۱۹۸۵ء کو دی گئی۔

ریزیڈنٹ ڈائریکٹر

پاکستان نیشنل سینٹر ۔ کراچی

فون: ۲۳۱۳۳۴

پاکستان نیشنل سینٹر

سوانحی مطالعہ — ۶

قائد اعظم

میری نظر میں

قائدِ اعظم

میری نظر میں

(رفقاء اور معاصرین کے تاثرات)

ترتیب و تدوین

زکریا ساجد

قائدِ اعظم اکادمی

تعاون: پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن

ناشر — قائد اعظم اکادمی
۲۹۶ ایم اے جناح روڈ کراچی ۵

جملہ حقوق — بحق ناشر محفوظ

طبع اوّل — مارچ ۱۹۸۳ء

سر ورق — رشید صدیقی

طابع — احمد برادرز پرنٹرز
کمرشل ایریا ناظم آباد ۲، کراچی ۱۸

قیمت — اعلیٰ ایڈیشن — ۹۰ روپے
سستا ایڈیشن — ۲۰ روپے

اس کتاب میں جن خیالات، نظریات اور تاثرات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ خالصتاً انٹرویو دینے والوں کے انداز فکر اور مشاہدے کا نتیجہ ہیں۔ قائد اعظم اکادمی یا کوئی اور ادارہ اس کا ذمہ دار نہیں۔

فہرست

قائداعظم سیرت اور کردار

قائداعظم اور نوجوان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

قائدِ اعظمؒ کی حیات و عہد اور مسلم ہند کی تحریکِ آزادی کے مختلف گوشوں کے متعلق تحقیقی مآخذ کی نشان دہی اور ان کو مرتب و یکجا کرنے کا کام قائدِ اعظم اکادمی کے اوّلین مقاصد میں شامل ہے۔ اس ضمن میں اکادمی نے کئی ایک منصوبوں پر کام شروع کر رکھا ہے جن میں (۱) اس عہد کے مآخذ کی اشاعت (۲) قائدِ اعظمؒ اور تحریکِ آزادی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق تحقیقی مواد کی اشاعت اور (۳) اس عہد اور موضوع پر مستند انگریزی مطبوعات کے اردو اور علاقائی زبانوں میں تراجم کا اہتمام خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

قائدِ اعظمؒ میری نظر میں بیک وقت مندرجہ بالا پہلے اور دوسرے مقاصد کے حصول کی ایک امتیازی کوشش ہے جس میں قائدِ اعظمؒ کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا جائزہ ان کے معاصرین اور رفقائے کار کی زبانی پیش کیا گیا ہے ان خواتین و اصحاب میں سیاست دان اور سیاسی کارکن بھی شامل ہیں، سرکاری ملازمین اور قانون داں بھی، اور نوجوان طلبہ و طالبات بھی۔ ان تاثرات کا اوّلین اظہار قائدِ اعظمؒ کی

وفات کے بعد مختلف مواقع پر ریڈیائی تقریروں کی صورت میں کیا گیا۔ ہم پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن کے شکرگزار ہیں کہ اس نے ان تقریروں کی ادارت و اشاعت کا کام قائداعظم اکادمی کو تفویض کیا۔ کارپوریشن نے تقریروں کے متن ہمارے حوالے کیے اور پروفیسر زکریا ساجد، شعبۂ صحافت، کراچی یونیورسٹی نے انہیں ہماری استدعا پر مناسب تدوین و ادارت کے بعد موجودہ مجموعے کی صورت دی۔

مؤلف نے بڑی محنت اور سلیقے سے مضامین کو قائداعظمؒ کی شخصیت اور ان کے حلقۂ عقیدت کے حوالے سے پیش کیا ہے جس کے لیے ادارہ ان کا بے حد ممنون ہے۔ اس طرح یہ مجموعہ نہ صرف قائداعظمؒ اور تحریکِ پاکستان پر تحقیق کے ایک ماخذ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے بلکہ یہ قارئین بالخصوص نوجوان نسل کے لیے قائداعظمؒ سے عقیدت اور پاکستان سے محبت و وابستگی پیدا کرنے میں بھی محرک ثابت ہوگا۔ مقررین کے سوانحی خاکوں اور اشاریہ کی شمولیت نے کتاب کی افادیت میں اور اضافہ کر دیا ہے۔

مجھے امید ہے کہ قائداعظم اکادمی اور پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن کی یہ مشترکہ کوشش دوسرے اداروں کے لیے بھی قابلِ تقلید مثال تصور ہو گی۔

کراچی۔ یکم مارچ ۱۹۸۴ء

پروفیسر شریف المجاہد
ڈائرکٹر، قائداعظم اکادمی

تعارف

بیسویں صدی کی قیادت عظمیٰ میں قائداعظم محمد علی جناحؒ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کی تحریک آزادی میں اپنے فیصلہ کن کردار اور بالخصوص مسلم ہند کا واحد نمائندہ قائد ہونے کے باعث بہت عرصہ ملکی اور غیر ملکی صحافیوں، تجزیہ نگاروں، مصنفوں اور دانشوروں کی توجہ کا مرکز رہے اور تحریک آزادی کے آخری دس سالوں میں تو ان پر ہندوستان، برطانیہ اور دنیا کے دوسرے ممالک کے جرائد و رسائل میں اتنا کچھ لکھا گیا کہ یہ مواد بجائے خود ایک منضبط اور مبسوط تحقیقی مطالعہ کا مستحق ہے۔

اگرچہ مسلم پریس نے اپنی بے سروسامانی اور پسماندگی کی وجہ سے قائداعظمؒ اور تحریک پاکستان اور اس کے رہنماؤں کے بارے میں کوئی خاص بڑی تعداد میں مضامین اور مقالے شائع نہیں کیے۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد جب ہماری صحافت کو آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا تو ہمارے اخبارات و رسائل میں ہمارے اکابر کا تذکرہ عام ہونے لگا اور دیگر ذرائع ابلاغ مثلاً ریڈیو وغیرہ بھی تحریک پاکستان اور اس کے رہنماؤں کے کارناموں کی تفصیلات ملک کے گوشے گوشے میں پہنچانے لگے۔ یہ امر ہم سب کے لیے باعث فخر ہے

کہ قائداعظمؒ کے یوم وفات (۱۱ ستمبر) اور یوم ولادت (۲۵ دسمبر) یوم پاکستان (۲۳ مارچ) اور یوم آزادی (۱۴ اگست) اور دیگر قومی اہمیت کی تقریبات پر بانیٔ پاکستان کو یاد کرنا ان کی حیات و کردار کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالنا اور ان کی تعلیمات کو اجاگر کرنا اب ایک مسلمہ قومی روایت بن گیا ہے۔

یہ شاندار روایت صرف نو آزاد ملکوں سے ہی مختص نہیں بلکہ طویل تاریخ رکھنے والے ملک بھی اہم قومی مواقع پر اپنے رہنماؤں کی یاد مناتے ہیں اور ان کے اقوال و افکار کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنانے کے عزم کی تجدید کرکے اپنی ملت میں اتحاد و یگانگت کے جذبات کو پروان چڑھاتے ہیں۔ اس ضمن میں پاکستان کی حکومت اور ذرائع ابلاغ نے بھی اس قومی فریضہ کا احساس کرکے بانیٔ پاکستان کو ان کے رفقاء کے افکار اور تاثرات کو زندہ رکھنے کا جو اہتمام کیا ہے اس میں ریڈیو پاکستان (پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن) کا حصہ نمایاں ہے۔ ریڈیو پاکستان نے قائداعظمؒ اور ان کے رفقاء کا نام اور کام کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ قومی اہمیت کے مختلف مواقع پر قائد کے ساتھیوں، معاصرین اور دیگر مشاہیر کے انٹرویو پیش کیے جن سے بانیٔ پاکستان کی سیرت و کردار، قومی اور سیاسی افکار اور تعلیمات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان مقررین میں قائداعظمؒ کے ذاتی عملہ کے لوگ اور عزیز رشتہ دار بھی شامل ہیں جنہیں بانیٔ پاکستان کو نہایت قریب سے محض ایک انسان کی حیثیت میں دیکھنے کا موقع ملا۔ پھر ان کے رفقاء ہیں جن میں

نوجوان طلبا اور طالبات اور سیاسی کارکنوں کے علاوہ آزمودہ کار سیاست دان بھی شامل ہیں، بعض اور لوگ بھی ہیں جنہیں قائدِ اعظم کو کام کرتے دیکھنے کا موقع ملا۔

پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن کو عرصے سے اس سلسلے کے منتخب انٹرویو اور تقریریں شائع کرنے کا احساس تھا۔ بالآخر قائدِ اعظم اکادمی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ اور اب ریڈیائی تقریروں کا انتخاب آپ کے سامنے ہے۔

ریڈیائی تقریروں اور ملاقاتوں کے حق میں اسلوبِ بیان کی ناہمواری، ربط و تسلسل کا فقدان، واقعات کا اعادہ و تکرار عام سی شکایات ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ مجموعے کو دلچسپ، دلنشین اور مربوط بنایا جائے۔ اس مقصد کے لیے بہت سی تقریروں کے ایسے حصوں کو حذف کر دیا گیا ہے جو تکرارِ محض یا الفاظ کے آئینہ دار تھے۔ اگرچہ مجموعے کی ترتیب تاریخی یا واقعاتی اعتبار سے ممکن نہ تھی، تاہم مضامین کی ترتیب و پیشکش میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ اس سے قائدِ اعظمؒ کی شخصیت کو سمجھنے کے سلسلے میں قارئین کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالوں کے جواب ایک ارتقائی صورت میں سامنے آئیں۔

قائدِ اعظم کے سوانح، سیرت و کردار اور اقوال و افکار پر اب تو مبسوط اور ضخیم کتابیں موجود ہیں اور اس سلسلے میں اخبارات و رسائل میں مختلف مشاہیر اور شخصیتوں کے جو مضامین اور انٹرویو شائع ہو چکے ہیں، ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس اعتبار سے

ریڈیائی تقریروں کے اس مجموعے کے بارے میں کسی نمائندہ یا مستند حیثیت کا دعویٰ کرنا خارج از بحث ہے۔ تاہم مجھے امید ہے کہ "قائد اعظم میری نظر میں" قائد اعظمؒ کے سوانحی ادب میں اس لحاظ سے قابل قدر اضافہ تصور ہوگا کہ اس میں بانیٔ پاکستان کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ان کو بہت قریب سے دیکھنے اور جاننے والے حضرات کا مشاہدہ ہے اور اسے قبول عام حاصل ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ قائد اعظمؒ کی شخصیت کو سمجھنے پرکھنے اور قیام پاکستان کی غرض و غایت کو واضح کرنے میں معاون ثابت ہوگا اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

میں خواجہ رضی حیدر، ڈپٹی ڈائریکٹر قائد اعظم اکادمی اور اسسٹنٹ لیکچرار شعبہ صحافت کراچی یونیورسٹی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے سوانحی خاکے اور اشاریہ مرتب کرنے میں میرا ہاتھ بٹایا۔

ذکریا ساجد
صدر شعبہ صحافت کراچی یونیورسٹی

۲۸ فروری ۱۹۸۳ء

شیخ سر عبدالقادر

محبوب ترین قائد

ہم نے بڑے بڑے آدمیوں کے جنازے اٹھتے
دیکھے۔ بہت سی بڑی شخصیتوں کے گزر جانے پر ان
کے مداحوں کو روتے پیٹتے دیکھا، مگر جس شان سے
قائداعظم کا جنازہ اٹھا اور ان کی وفات پر دلی اندوہ و غم
کا اظہار کروڑوں بندگانِ خدا نے پاکستان کے گوشے
گوشے میں کیا ان کی مثال ملنا محال ہے۔

پرانے زمانے کے اطالیہ میں ایک عجیب
رسم تھی کہ کسی مرنے والے کے عزیزوں اور
دوستوں کے آنسو جمع کیے جاتے تھے۔ میں نے
جب اثنائے سیاحت پمپیائی کا مشہور اجڑا
ہوا شہر دیکھا تو وہاں بعض گھروں کی الماریوں

میں چھوٹی چھوٹی شیشیاں نظر آئیں جن میں
پانی سا بھرا ہوا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا
کہ مرنے والے کے ماتم میں اس کے جو دوست
شریک ہوتے تھے وہ اپنے آنسو شیشیوں
میں ٹپکاتے تھے اور جس کے مرنے پر بہت
سی شیشیاں آنسوؤں سے پُر ہوتی تھیں ان کی
تعداد کی کثرت اس کی ہر دلعزیزی کا معیار ہوتی
تھی۔

اگر ہماری قوم میں کوئی ایسا ہی رواج ہوتا
اور وہ سب آنسو جو مسلمانوں نے جا بجا قائدِاعظمؒ
کی اندوہگیں وفات پر بے اختیار بہائے جمع کیے جا
سکتے تو ایک طوفانِ اشک بپا ہو جاتا۔

قائداعظمؒ ، سیرت اور کردار

"ہندوستان کے از سرنو آزاد ہونے کے عظیم ڈرامے کے آخری مرحلے میں جن شخصیتوں نے حصہ لیا ان میں محمد علی جناح بیک وقت سب سے زیادہ پُراسرار اور سب سے زیادہ اہم تھے۔ یہ تو تصور کیا جا سکتا ہے کہ ڈرامے کے دوسرے اہم کرداروں میں فلاں شخصیت کا بدل کوئی اور بھی ہو سکتا تھا یا فلاں سیاستداں یا جماعت کی رہنمائی فلاں کی بجائے فلاں صاحب بھی کر سکتے تھے۔ حتیٰ کہ آخری وائسرائے کا کردار بھی کوئی اور بخوبی ادا کر سکتا تھا لیکن اس ڈرامے کا انجام بہرحال مختلف نہ ہوتا اور یہ تصور ہرگز نہیں کیا جا سکتا کہ محمد علی جناح کی شخصیت اور قیادت کے بغیر واقعات یہ رخ اختیار کر لیں گے اور حصول آزادی کے لئے آخری نتیجہ آزمائی دو بڑے حریفوں کی بجائے تین فریقوں میں ہو گی اور پاکستان کی نئی قوم اور ریاست معرض وجود میں آئے گی۔"

ایچ۔ وی ہڈسن دی گریٹ ڈیوائڈ ص ۲۷

میجر جنرل محمد اکبر خان

اللہ پہ توکل

مولانا محمد علی ایک مرتبہ کارونیشن ہوٹل ایکسی دہلی میں ٹھہرے ہوئے تھے میں وہاں جاتا تھا۔ ایک دن مولانا نے فرمایا "بھائی اتوار کے دن ضرور آؤ۔ میں تمہیں کچھ دوستوں سے ملانا چاہتا ہوں۔" جب میں گیا تو مجھے مسٹر محمد علی جناح سے ملایا گیا ایک دو صاحبان اور بھی تھے۔ ان کے نام یاد نہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اور صاحبان تو محض شریک محفل تھے۔ اصل شخصیت تو مسٹر جناح کی تھی جو مجھ سے فوج کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتے تھے۔ مولانا نے خود تو بات چیت میں کوئی حصہ نہیں لیا، ایک طرف بیٹھ گئے اور سنتے رہے اور کاغذ کے پرچے پر کبھی کبھی سوال لکھ کر جناح صاحب کو دیتے رہے۔ جناح صاحب مجھ سے سوال کرتے رہے۔ میں یہ عرض کر دوں کہ یہ پہلی جنگ عظیم کے بعد کا واقعہ ہے۔ کانگریس ہائی کمان نے ایک ڈیفنس کمیٹی بنائی تھی۔ اور جناح صاحب اس کے سیکرٹری تھے۔ اس کے ممبروں میں پنڈت موتی لال نہرو اور چند دوسرے مشہور سیاست دان تھے۔

جناح صاحب مجھ سے پوچھتے رہے کہ آپ کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے؟ فوج کی کیا حالت ہے؟ تقریباً دو گھنٹے وہ مجھ سے سوالات کرتے رہے۔ جب چلنے

لگے تو فرمایا "دیکھو بھئی! کسی سے تم یہ نہ بتانا کہ ہم سے ملے ہو۔ ہم لوگ نہیں چاہتے کہ تم فوج کو چھوڑ دو۔ اپنی زبان پر قابو رکھو۔ جب کبھی پھر موقع ملے گا ہم آپ سے کچھ اور پوچھ لیا کریں گے۔"

قیام پاکستان کی تقریبات کے لیے جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی پہنچے تو میں بھی اس وقت قائد اعظمؒ کے ملٹری سیکرٹری کے طور پر دوسرے لوگوں کے ہمراہ ان کے استقبال میں شریک تھا۔ ۱۴ اگست کو جب میں گورنمنٹ ہاؤس میں دوبارہ حاضر ہوا۔ اور شاید مناسب ہو گا کہ میں یہ عرض کر دوں کہ میں فوجی معاملات میں قائد اعظمؒ کا مشیر تھا لہٰذا ہر وقت میرا حاضر رہنا لازمی تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قائد اعظمؒ کو ایک لفافہ دیا اور کہا کہ اسے پڑھ لیجیے۔ قائد اعظمؒ نے اسے کھولا اور سرسری نظر سے پڑھا۔ میں بھی ان کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن بھی بڑے غور سے دیکھتی رہیں کہ ان کے تاثرات کیا ہیں یا کچھ پتہ چلے کہ کیا سوچ رہے ہیں؟ لیکن قائد اعظمؒ نے پڑھ کر لفافہ اپنی جیب میں رکھ لیا اور کہا "اب چلیں؟" لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ "دیکھئے میں نے آپ کو اطلاع دے دی ہے اور میں کہتا ہوں کہ آپ کی جان خطرے میں ہے۔ سکھوں نے منصوبہ بنایا ہے کہ جس وقت آپ اسمبلی ہال جائیں گے تو آپ کو قتل کر دیا جائے۔" قائد اعظمؒ نے کہا "اگر مجھے قتل کر دیا گیا تو میں شہید ہوں گا۔ اور مسلمان کے لیے شہید ہونا افضل ترین اعزاز ہے لہٰذا اس کی فکر نہ کرو!" لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا "نہیں نہیں مجھے تمہاری جان کی بڑی ضرورت ہے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہاری حفاظت کا انتظام کروں۔ میرے پاس گارڈ بریگیڈ یہاں موجود ہے اور مجھے معلوم ہے کہ آپ کے پاس یہاں مسلمانوں کی کوئی فوج نہیں ہے۔" قائد اعظمؒ نے میری طرف دیکھا۔ میں نے عرض کیا کہ اب میرے پاس دو کمپنیاں ہیں، فرسٹ اور سیون بلوچ رجمنٹ، جن کو میں نے حفاظت پر لگا دیا ہے باقی میں نے سی آئی ڈی پولیس کا انتظام کیا ہے جو کہ آپ کی موٹروں کی حفاظت کرے گی دس موٹر سائیکلیں آگے پیچھے رہیں گی۔ قائد اعظمؒ نے کہا کہ میرے لیے یہی ضرورت

سے زیادہ ہے۔ میں ضرور جاؤں گا۔"

ماؤنٹ بیٹن نے کہا "میں پھر بھی آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ اس اسمبلی کی میٹنگ کی کوئی خاص ضرورت تو ہے نہیں، بالکل رسمی ہے۔ اس رسمی میٹنگ کو ہم یہاں گورنمنٹ ہاؤس میں کیوں نہیں طے کر لیتے۔ آپ نے خطرہ مول لیا ہے میں آپ کو چارج دیتا ہوں، آپ چارج لے لیجئے۔ چونکہ مجھے آج رات بھی جانا ہے اس لیے میرا کام بھی ہلکا ہو جائے گا اور جو خطرہ ہے وہ بھی ٹل جائے گا۔" قائداعظمؒ نے کہا "ہرگز نہیں میں نے اپنا پروگرام بنا لیا ہے اب اسے میں تبدیل نہیں کر سکتا، میں ضرور جاؤں گا۔"

چنانچہ ہم گئے۔

جب ہم واپس آئے تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا "قائداعظم میں آپ کو دلی مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ بچ کر آ گئے۔ غالباً اس لیے کہ میں آپ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔" قائداعظمؒ نے کہا "نہیں! اللہ میرا محافظ تھا اس لیے میں بچ گیا!"

حیرت کی بات یہ ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اتنا بڑا نفسیاتی حربہ استعمال کیا مگر قائداعظمؒ کے اعصاب اس قدر مضبوط تھے کہ انہوں نے نہ اپنا پروگرام بدلا نہ ان کے تاثرات کا ان کے چہرے پر اظہار ہوا۔ قائداعظم دراصل آہنی عزم اور ارادے کے انسان تھے اور انہیں خدا کی ذات پر بے حد بھروسہ تھا۔

ماؤنٹ بیٹن نے سب سے پہلے قائداعظمؒ پر جو نفسیاتی حملہ کیا یعنی سکھ ان پر قاتلانہ حملہ کریں گے اور ان کے پاس حفاظت کے لیے کوئی انتظام نہیں ہے، لہذا انگریزوں کی مدد درکار ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ حکومت پاکستان کی سالمیت کے لیے سارے اختیارات انگریزوں کے ہاتھ میں رہیں۔ لیکن قائداعظمؒ نے اسے ٹھکرا دیا۔

گروپ کیپٹن عطا ربانی

گورنر جنرل کے ساتھ

۱۹۴۳ء کی بات ہے میں ابھی گورنمنٹ کالج میں تھا کہ پتہ چلا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں ہو رہا ہے۔ پھر ایک جلسۂ عام ہوگا جس سے قائداعظمؒ خطاب فرمائیں گے۔ میں چند احباب کے ساتھ دہلی پہنچا تو قائداعظمؒ جلسے میں موجود تھے۔ پچھلی صف میں کرسیوں پر اور کچھ ڈائس پر مسلم لیگ کے بہت سے دیگر زعماء بیٹھے ہوئے تھے عبدالمجید سندھی ایک کونے پر پاؤں لٹکائے اور ساتھ ہی راجہ صاحب محمود آباد بیٹھے تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو چھل میاں فرنگی محل تقریر کر رہے تھے۔ ان کے بعد راجہ صاحب نے تقریر کی۔ آخر میں قائداعظمؒ نے خطاب کیا۔ وہ تقریباً ۴۵ منٹ تک انگریزی میں بولتے رہے۔ حالانکہ عام طور سے لوگ انگریزی نہیں سمجھتے تھے لیکن جلسے میں مکمل خاموشی تھی اور لوگ بڑے انہماک سے تقریر سن رہے تھے جیسے ایک ایک لفظ ان کی سمجھ میں آرہا ہو۔ یہ میرا پہلا موقع تھا جب میں نے انہیں دیکھا۔

قائداعظمؒ سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۵ء میں ہوئی۔ اس کی روداد یہ ہے کہ جب میں بہار کے محاذ پر تھا اس وقت قائداعظمؒ نے مسلم لیگ فنڈ کے لیے اپیل کی تھی۔ میں نے بہار میں اپنے دوستوں کو ساتھ ملا کر کچھ چندہ جمع کیا۔ پھر میرا تبادلہ کلکتہ ہو گیا۔ میں نے یہ مہم وہاں بھی جاری رکھی۔ اور جب حساب لگایا تو

تقریباً ۲۴ ہزار پانچ سو روپے ہو گئے تھے۔ انتخابی مہم کے سلسلے میں قائدِ اعظم کلکتہ تشریف لائے تو حسین شہید سہروردی ان کے ساتھ تھے۔ میں نے ان سے ملاقات کی اور کہا کہ میں نے اتنی رقم اکٹھی کی ہے اگر آپ قائدِ اعظمؒ سے ملاقات کرا دیں تو میں ان کو یہ رقم پیش کر دوں۔ انہوں نے وقت بتا دیا کہ میرے گھر آ جائیں ملا دوں گا۔ اس وقت قائدِ اعظمؒ اصفہانی صاحب کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے وہ مجھے وہاں لے گئے۔ قائدِ اعظمؒ نے آنے کا مقصد پوچھا تو میں نے بتایا کہ میں نے کچھ حقیر سی رقم اکٹھی کی ہے جو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے دریافت کیا کب اور کہاں جمع کی۔ میں نے تفصیل بتائی تو بہت خوش ہوئے اور اپنے ہاتھ سے رسید لکھ کر دی اور مجھ سے ہاتھ ملایا۔

یہ میری پہلی ملاقات تھی جب مجھے ان سے ہاتھ ملانے کا شرف حاصل ہوا۔ قائدِ اعظمؒ سے مل کے دل میں عجیب سی خوشی اور خود آگہی کا احساس ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں اللہ تعالیٰ نے میری ایک دیرینہ آرزو پوری کی اور مجھے ایئر فورس کی طرف سے ان کا اے ڈی سی مقرر کیا گیا۔ یہ بڑا پُر لطف واقعہ ہے۔ میں جولائی ۱۹۴۷ء میں ایک ماہ کی رخصت پر تھا۔ جالندھر اور راولپنڈی میں رخصت گزار رہا تھا کہ اچانک مجھے تار ملا کہ "فوراً دہلی پہنچو!" میں خاموش رہا۔ دوبارہ مجھے تار موصول ہوا کہ "فوراً پہنچو!" میں پھر چپ ہو رہا۔ پھر مجھے اسی مضمون کا تیسرا تار ملا اور میں نے اس پر بھی کوئی توجہ نہ دی۔ دراصل مجھے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں میری چھٹیاں منسوخ کر کے کسی سرکاری کام پر نہ لگا دیا جائے۔ غرضیکہ جب چھٹیاں گزارنے کے بعد میں دہلی روانہ ہوا تو راستے میں ایک خبر نظر سے گزری کہ قائدِ اعظمؒ ۷ اگست کو کراچی روانہ ہونے والے ہیں اور اس اثناء میں ان کے اسٹاف کا انتخاب ہونے والا ہے۔ اس وقت میرے دل سے ایک دعا نکلی کہ کاش میں بھی ان میں سے ہوتا جو منتخب ہو گئے ہیں۔ ذہن میں ایک بات آئی کہ آج ۵ تاریخ ہے اور ۷ تاریخ کو قائدِ اعظم نے روانہ ہونا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے۔ اب تک تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ہوگا۔ یہ سوچ

کہ مجھے دل ہی دل میں بے حد صدمہ ہوا۔

جب گاڑی دہلی اسٹیشن پر رکی تو میری بیوی کے چچا علی نواز مرحوم بے حد مجھے آوازیں دے رہے تھے۔ ان کی آواز میں گھبراہٹ اور خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اور چونکہ مجھے انہی کے گھر ٹھہرنا تھا۔ لیکن اسٹیشن پر ان کی آواز قطعی غیر متوقع تھی۔ میں جب باہر آیا تو کہنے لگے کہ "علی! یار تم کدھر تھے۔ ہیڈ کوارٹر سے تار پہ تار بھیجے گئے لیکن تمہارا کہیں پتہ نہیں تھا۔" میں نے پوچھا "بات کیا ہے؟ اور ایسی کیا بات تھی کہ تار پہ تار بھیجے گئے؟" تو انہوں نے انکشاف کیا "تم قائد اعظم کے لئے ڈی سی مقرر کیے گئے ہو۔" میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے ٹیکسی لی اور سیدھا ہیڈ کوارٹر جا کر رپورٹ دی۔ وہاں پتہ چلا کہ مجھے پرسوں روانہ ہونا ہے اور میں فوراً چوہدری محمد علی سے ملوں۔ میں محمد علی صاحب کے پاس گیا تو وہ میرے منتظر تھے۔ انہوں نے کہا نوابزادہ لیاقت علی خان تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں لیاقت علی خان کے گھر گل رعنا پہنچا وہ کھانے میں مصروف تھے۔ کھانے کے بعد لیاقت علی خان نے قائد اعظم کو فون کیا اور مجھے کہا کہ تم بنگلے پر پہنچو۔ میں وہاں لیاقت علی خان کی گاڑی پر پہنچا اور آنے کا مقصد سیکرٹری کو بتایا۔ تقریباً پندرہ منٹ انتظار کے بعد میری نظر قائد اعظم پر پڑی جو وہاں سے گزر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے "آپ مسٹر عطا ربانی ہیں؟" میری آواز بیاں اور ڈر کی وجہ سے نہ نکل سکی۔ میں نے گردن کے اشارے سے ہاں کہا۔ پھر پوچھنے لگے کیا بات تھی جو تمہیں مدد کے ہوئے تھی؟ تم کہاں غائب تھے؟ کچھ ذاتی سوال پوچھے۔ اور آخر میں دریافت فرمایا کہ اس کام کا کوئی ذاتی تجربہ ہے؟ پھر خود ہی کہنے لگے کہ کوئی بات نہیں تم ۰۱ تاریخ کو صبح ۱۰ بجے تیار ہو کر یہاں آ جاؤ۔ اور شکریہ کہہ کر چلے گئے۔ جاتے جاتے پھر مڑے اور فرمایا کہ لیاقت کو بتا دو کہ مجھے تمہارا سلیکشن منظور ہے۔

میں وقت مقررہ پر وہاں پہنچ گیا۔ قائد اعظم تقریباً دو بجے گھر سے نکلے۔ سفید

شیروانی اور شلوار میں ملبوس تھے۔ میں باہر کھڑا تھا۔ جب قائداعظمؒ آئے تو میں نے سلام
کیا۔ ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔ منہ سے کچھ نہ بولے۔ ایسا لگتا تھا کچھ سوچ رہے ہیں۔ ایک
گاڑی میں مس جناح اور قائداعظمؒ بیٹھے۔ دوسری گاڑی میں لفٹیننٹ احسن اور دوسرے
لوگ تھے۔ ہم رنگ پالم کے ہوائی اڈے پر پہنچے۔ کراچی تک سفر کے لیے لارڈ ماؤنٹ
بیٹن نے ڈکوٹا جہاز مہیا کیا تھا۔

اس ڈکوٹے میں اس دن ہم صرف پانچ مسافر تھے۔ قائداعظمؒ نے کھڑکی کے پاس
کی سیٹ منتخب کی۔ جس سے پورا منظر نظر آتا تھا۔ جب جہاز نے اڑنا شروع کیا
تو آخری بار قائدؒ نے باہر دیکھا اور کہا That is the end of it اور پھر
چپ چاپ بیٹھ گئے۔ جب ہمارا جہاز کراچی کے ہوائی اڈے ماڑی پور پہنچا تو بڑی
خلقت جمع تھی۔ یہاں تک کہ جہاز سے گاڑی تک راستہ بنا کر قائدؒ کو ہجوم کے
درمیان سے لایا گیا۔

ایک اور واقعہ یاد آیا۔ جب میں ۷ اگست کو قائداعظمؒ کے ہمراہ پاکستان پہنچا
تو میری بیوی میرے ساتھ نہیں آئی تھیں وہ ۱۳ اگست کو گاڑی سے راولپنڈی آئیں
ان کے آنے کے ایک ہفتے کے بعد ایک دن میں اپنی بیوی سے ٹیلی فون پر بات
کر رہا تھا۔ فون کچھ خراب تھا اس لیے بات بہت زور زور سے کرنا پڑ رہی تھی کہ
اچانک قائداعظمؒ کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا قائداعظمؒ
دفتر سے اوپر جا رہے ہیں۔ انہوں نے مڑ کر پوچھا "ربانی کس کو فون کر رہے تھے؟"
میں نے کہا "راولپنڈی میں اپنی بیوی سے بات کر رہا تھا۔"

کہنے لگے "Don't shout at the lady" پھر اوپر چلے گئے

اسی طرح ایک دن لیاقت علی خان ان کی بیگم اور دوسرے مہمان قائداعظمؒ کے
گھر کھانے پر مدعو تھے۔ کھانے کے دوران قائداعظمؒ نے لیاقت علی خان سے پوچھا
کہ تم نے پشاور بات کر لی ہے؟" لیاقت علی خان نے جواب دیا کہ "آج نہیں کر
سکا، شاید فون خراب تھا۔ قائداعظمؒ فرمانے لگے "ربانی سے کہا ہوتا، یہ سمجھتا ہے

کہ اس کی آواز پشاور تک جاتی ہے۔"

قائداعظم کی اصول پسندی: قائداعظم اصول کے بہت پابند تھے۔ اور اکثر ہم لوگوں کو بھی تاکید کرتے تھے کہ تم لوگ فضول خرچی نہیں کیا کرو۔ نوجوان، بالخصوص تم جیسے مسلمان نوجوان، پیسے کی قدر نہیں کرتے۔ تم لوگوں کو احساس نہیں کہ پیسہ کس طرح کمانا چاہیے اور کہاں نہیں۔ تم لوگوں کو قطعی فکر نہیں کہ کل کیا ہو گا۔ اور اکثر اپنے بارے میں بتایا کرتے تھے کہ خود شروع میں جب میں بمبئی میں پریکٹس کیا کرتا تھا تو روزانہ صبح گھر سے دفتر تک جانے کے لیے ایک آنہ کرایہ لگتا تھا تو میں سوچتا تھا کہ یہ ایک آنہ بچاؤں یا کرایہ ادا کروں۔ اور میں نے تو فیصلہ کر کے یہ بچا لیا کرتا تھا۔

وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جہاں ایک روپیہ خرچ ہوتا ہے وہاں پانچ پیسے خرچ کیے جائیں۔ قائداعظمؒ پیسہ ضائع کرنے کی بجائے بامقصد طریقے سے خرچ کرنا چاہتے تھے۔ قائداعظمؒ جس زمانے میں پاکستان کے گورنر جنرل تھے پاکستان کے اکثر زعما ان سے ملنے آتے تھے مگر جب ان کے سامنے پہنچتے تو ان کی حالت عجیب ہو جاتی۔ بے حد گھبرائے ہوئے رہتے کہ نہ جانے قائداعظمؒ کا موڈ کیسا ہو۔ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد جب حسین شہید سہروردی پہلی بار کراچی آئے تو انہوں نے قائداعظمؒ سے انٹرویو مانگا۔ اس دن میں ڈیوٹی پر تھا۔ میں ان کو دفتر لے کر گیا۔ راستے میں بات ہوئی تو میں نے کہا اب آپ آ گئے ہیں، واپس تو نہیں جائیں گے، یہاں بہت کام ہے آپ یہاں کوئی وزارت لے لیں، فرمایا: "دیکھو! بلایا تو ہے، دیکھیں کیا کہتے ہیں۔" خیر اندر جانے سے پہلے انہوں نے اپنی شیروانی کے تمام بٹن باقاعدہ بند کیے پھر اندر گئے۔ اندر کیا ہوا وہ میں نہیں جانتا مگر جب باہر نکلے تو پریشان تھے موڈ بہت خراب تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں نے دریافت کیا: کیا ہوا، آپ یہیں رہیں گے نا؟" غصے سے کہنے لگے: "نہیں! مجھے لگتا حالات ایسے ہیں میں نہیں رہ سکوں گا۔" میں نے کہا یہ تو بڑا challenging job ہے، ایسے ہی کام میں انسان کے جوہر کھلتے ہیں۔ آپ اسے قبول کر لیں۔ ملک کو آپ کی ضرورت ہے۔"

اسی طرح ایسے فضل الحق ایک مرتبہ گورنر جنرل ہاؤس میں کھڑے تھے تو قائدؒ تشریف لے آئے۔ ابھی وہ اتنے گز دور ہی تھے کہ فضل الحق صاحب نے فرشی سلام کرنا شروع کر دیا اور جھکے کھڑے رہے۔ یہ دیکھ کر قائد اعظمؒ کو بہت ناگوار گزرا۔ یہاں تک کہ سلام کا جواب دیئے بغیر ہی ان کے قریب سے گزر گئے۔

قائدؒ کی جامہ زیبی، ایک بات جو مجھے یاد ہے وہ یہ کہ قائد اعظمؒ صبح سے شام تک ایک ہی سوٹ میں رہتے تھے۔ وہی سوٹ پہن کر دفتر جاتے اور گھر لوٹتے اور اسی کو پہنے پہنے تھوڑا بہت آرام بھی کر لیتے۔ لیکن جب شام کو دیکھئے تو کیا مجال کہ سوٹ کی کریز میں کوئی فرق آئے۔ یہ سب احتیاط کا نتیجہ تھا۔ مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک دن ان کے لیے ایک ٹاٹ کی طرح کا سفید کپڑا خریدا گیا جو دیکھنے میں بالکل معمولی سا لگتا تھا۔ ہم لوگوں نے سوچا نہ معلوم قائد اعظمؒ اس کا کیا استعمال کریں گے۔ اتنی بڑی شخصیت اور یہ کپڑا! خیر دوسرے دن حکم ملا "ٹیلر کو بلاؤ"۔ ٹیلر آیا، ناپ اور کپڑا لے کر چلا گیا۔ اور جب پہلی مرتبہ اس کپڑے کا سوٹ پہنا تو میں بیان نہیں کر سکتا کہ وہ کپڑا کتنا خوبصورت لگ رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قائد اعظمؒ بڑے جامہ زیب انسان تھے۔

اگست کے وسط میں تھوڑا عرصہ بعد اپنے کمرے سے سہ پہر کو ٹہلا کرتے پہلے تو کبھی گورنمنٹ ہاؤس کے آس پاس ٹہلتے۔ پھر ایک دن انہوں نے بڑے بڑے گیند گھاس پر پڑے دیکھے تو پوچھا کہ ان کو کس طرح کھیلتے ہیں۔ ہم لوگوں نے کھیل کر بتایا تو خود بھی کھیلنے لگے۔ پھر دوسرے دن بھی آ گئے اور کہنے لگے آؤ کھیلیں۔ ظاہر ہے ان کو یہ کھیل پسند ہی آیا ہوگا۔ کبھی کبھی بلیرڈ بھی کھیل لیتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ڈرائیونگ وغیرہ کے لیے نکل جاتے تھے۔ کسی کو پتہ نہیں ہوتا تھا کہ کدھر جانا ہے۔ بس نکل جاتے۔ یہ بھی موٹر سائیکل پائلٹ کے لیے ایک مصیبت بنی تھی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ چلتے چلتے گاڑی مڑوا دی۔ پائلٹ آگے نکل گیا۔ مڑ کر دیکھا تو پھر دوڑ جا کر ساتھ ہو جاتا۔ لیکن یہ سیر و تفریح اور یہ مشغلہ زیادہ دیر

جاری نہ رہ سکا۔ کاش وہ ایسا کرتے ان کی صحت پر خوشگوار اثر ہوتا اور کام سے
کچھ وقفہ تفریح کا مل جاتا۔ لیکن ایک تو کام کا دباؤ تھا۔ دوسرے مشرقی پنجاب
میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ دہلی اور دوسرے علاقوں میں خون خرابہ ہو رہا تھا۔
اس کا ان پر اس قدر ذہنی اور جذباتی بوجھ تھا جسے وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے
چنانچہ وہ قلیل وقت جو سیر و تفریح پر صرف کرنا چاہتے تھے وہ بھی قوم پر نچھاور کر دیا
اور ہر وقت کام میں لگے رہے "کام، کام، بس کام" یہی قائد اعظمؒ کی زندگی تھی۔

میں قائد اعظمؒ کے ہمراہ تقریباً چھ ماہ رہا۔ ایئر فورس کو میری ضرورت پڑ
گئی۔ کیونکہ رسالپور میں ہوا بازوں کی تربیت کے لیے جو اسکول بنایا تھا۔ اس کے لیے
استادوں کی بڑی کمی تھی۔ اور تقسیم کے وقت ہوائی فوج میں مسلمان استاد تقریباً نایاب
تھے۔ اس لیے پاک فضائیہ نے قائد اعظمؒ سے دو مرتبہ درخواست کی کہ مجھے ریلیز
کر دیں۔ ایک مرتبہ تو کمانڈر انچیف ایئر مارشل پیری کین خود گئے۔ لیکن جب وہ واپس
چلے گئے تو قائد اعظمؒ کہنے لگے۔ "بابی! تمہارے کمانڈر انچیف آئے تھے اور کہتے
تھے کہ ایئر فورس کو تمہاری ضرورت ہے!"

اس کے بعد میں نے اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔ دو چار روز کے بعد
جب ان سے اجازت لینے کے لیے حاضر ہوا تو میں نے ان سے کہا "مجھے جاتے ہوئے
کوئی ایسی چیز دے دیں جو میرے اور میرے بچوں کے لیے یادگار کی حیثیت رکھتی ہو"

قائد اعظمؒ نے میری درخواست کو قبول فرمایا اور مجھے ایک یادگار تصویر
دی۔ اس پر ان کے دستخط بھی ہیں۔ تصویر نہایت اعلیٰ ہے۔ اور اس سے پہلے
ٹائم اور لائف رسالوں میں شائع ہوئی تھی۔

سید مجاہد حسین

بابائے قوم

قائداعظم اسمبلی کے کام سے جب دہلی یا شملہ آتے تو انہیں ایک اسٹینوگرافر کی ضرورت ہوتی تھی۔ میں اس زمانے میں سیکرٹریٹ میں کلرک کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ میں ٹائپ جانتا تھا اور شارٹ ہینڈ سیکھ رہا تھا۔ ایک روز میرے شارٹ ہینڈ کے استاد نے مجھ سے کہا کہ میں مسٹر جناح سے ملوں کیونکہ انہیں ایک اسٹینوگرافر کی ضرورت ہے۔ یہ دسمبر ۱۹۳۷ء کی بات ہے۔ قائداعظمؒ لیاقت علی خان کے مکان "گل رعنا" میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں قائداعظمؒ سے ملنے گیا تو انہوں نے فوراً مجھے بلا لیا۔ سردی کا موسم تھا۔ اور صبح کے آٹھ بجے تھے قائداعظم بستر پہ لیٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی مجھے خطوط لکھوانا شروع کر دیئے۔ پہلا خط علامہ اقبال کے نام تھا۔ میں نے خط کا متن تیار کر کے دکھایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ تم اب باقاعدگی سے آیا کرو۔ یہ قائداعظمؒ سے میری پہلی ملاقات تھی۔

قائداعظمؒ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۰ء تک جب بھی شملہ یا دہلی آتے تو میں ان کی خدمت انجام دیتا تھا۔ میری عادت تھی کہ میں جس افسر کے ساتھ بھی کام کرتا۔ اس کی عادات و اطوار اور مزاج کا اندازہ کرتا اور اس کے مطابق خود کو ڈھال لیتا۔ قائداعظمؒ

کا لہجہ انگریزی تھا۔ اس لیے مجھے ان کی بات کو سمجھنے میں دشواری محسوس ہوا کرتی۔
تجربہ ہے کہ انہوں نے میری کسی غلطی پر مجھے نہیں ڈانٹا بلکہ وہ ہمیشہ میری غلطیوں
کو نہایت محبت سے درست کر دیتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے اصرار کیا کہ میں
پی اے کی حیثیت سے مستقلاً ان سے وابستہ ہو جاؤں اور ان کے ساتھ بمبئی چلوں
جہاں ان کا مستقل قیام تھا۔ میرے لیے دہلی یا شملہ سے دور جانا عملاً ممکن نہیں
تھا کیونکہ میری شادی ہو چکی تھی اور مجھ پر بیوی بچوں کی کچھ ذمہ داری بھی تھی چنانچہ
میں نے انکار کر دیا۔ قائد اعظمؒ نے مجھے قائل کرنے کے لیے دلائل دیئے۔ لیکن میں
آمادہ نہ ہوا۔ بعد میں قائد اعظم کہا کرتے تھے کہ تم بھی میری طرح بہت ضدی آدمی ہو۔
قائد اعظم کو مردم شناسی میں ملکہ حاصل تھا۔ اور وہ ہر کسی کی استعداد کار کو خوب
سمجھتے۔ اسی مناسبت سے پورے کام لیتے تھے۔ اس زمانے میں اسٹینوگرافر کی کھپت
بہت زیادہ نہیں تھی اور مسلمانوں کو تو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ ایک دفعہ میں نے
کسی جگہ ملازمت کے لیے درخواست دی لیکن ایک اور امیدوار کی کسی بڑے
آدمی نے سفارش کی اور اس کا انتخاب ہو گیا۔ کچھ دنوں کے بعد فیڈرل کورٹ میں
اسٹینو کی اسامی نکلی۔ میں نے قائد اعظمؒ سے درخواست کی کہ وہ سر شاہ محمد سلیمان
سے میری سفارش کر کے میری تقرری کرا دیں۔ قائد اعظمؒ یہ سن کر بہت ناراض ہوئے
اور کہنے لگے کہ تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی؟ تم اگر میرے بیٹے بھی ہوتے تو میں تمہاری
سفارش نہ کرتا۔ تمہیں شاید علم نہیں کہ حکومت نے میری سفارش حاصل کرنے کے
لیے کیسی کیسی چالیں چلی ہیں۔ پھر یہ محسوس کر کے کہ ان کے سخت رویے سے میری
دل آزاری ہوئی ہے قائد اعظمؒ نے ایک واقعہ مجھے سنایا۔ انہوں نے کہا کہ جب
انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کا محکمہ قائم ہوا تو برطانوی حکومت کے فنانس ممبر
سر بریکٹ اس کے نگران تھے۔ میں ان دنوں مرکزی اسمبلی میں انڈی پینڈنٹ پارٹی
کا لیڈر تھا۔ سر بریکٹ کو کسی معاملے میں میری پارٹی کی حمایت کی ضرورت تھی۔
چنانچہ وہ ایک دن میرے پاس آئے اور کہا کہ آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کے

لیے ملازمت نہیں مل رہی ہے۔ آپ دو چار مسلمانوں کے نام دے دیں تاکہ انہیں ملازم رکھ لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان کا مقصد میری سفارش حاصل کرنے کے بعد مجھے مجبور کرنا تھا کہ میں اسمبلی میں حکومت کی حمایت کروں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ تلاش کر لیں۔ آدمیوں کو ڈھونڈنا آپ کی ذمہ داری ہے میری نہیں۔ قابل مسلمانوں کی کمی نہیں جسے دل چاہے رکھ لیجئے۔ لیکن ان تقرریوں سے میرا کوئی سروکار نہیں۔ اس سخت رویہ پر سر بریکٹ خاموش ہو کر رہ گئے اور انہیں مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ پھر قائداعظمؒ نے مجھ سے کہا کہ "سفارش ایسی چیز ہے جو آدمی کو ذلیل و خوار کراتی ہے۔ اگر کچھ بننا چاہتے ہو تو اپنی صلاحیت اور محنت سے بنو۔"

قائداعظمؒ کسی شخص کو تعریفی سرٹیفکیٹ نہیں دیتے تھے۔ اس زمانے میں حکومت کا ضابطہ تھا کہ کوئی شخص سرکاری ملازمت کے ساتھ دوسرا کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اگر میں قائداعظمؒ سے معاوضہ لیتا تو مجھے حکومت سے اجازت لینا پڑتی۔ اس لیے میں نے قائداعظمؒ سے کہا کہ میں ان کے لیے بلا معاوضہ کام کروں گا۔ قائداعظمؒ نے اس کا بہت برا منایا لیکن بالآخر تیار ہو گئے۔ میں جولائی ۱۹۴۰ء میں سر الون کا پی اے تھا۔ وہ سپلائی کے سیکرٹری تھے اور بہت محنتی آدمی تھے۔ جنگ شروع ہوئی تو میری ترقی ہو گئی۔ قائداعظمؒ ان دنوں سیسل ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں ان سے ملنے گیا تو انہیں اپنی ترقی کے بارے میں بتایا۔ قائداعظمؒ نے کہا کہ "مجھے معلوم تھا کہ تم ضرور ترقی کرو گے۔ لیکن اب تم اپنی جگہ میرے لیے دوسرا آدمی لا دو۔" انہوں نے مزید کہا کہ "تم نے میرے ساتھ بہت محنت، محبت اور اطمینان سے کام کیا ہے اس لیے میں تمہیں کوئی تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ مس جناح باہر جا رہی ہیں وہ تمہارے لیے کوئی اچھا سا سوٹ کا کپڑا لا دیں گی۔"

میں نے عرض کیا کہ اگر آپ مجھے تحفہ دینا ہی چاہتے ہیں تو "تعریفی سرٹیفکیٹ" دے دیجئے۔ قائداعظمؒ نے کہا "سرٹیفکیٹ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ میں نے کبھی کسی کو نہیں دیا۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مجھے کوئی تمغہ دینا نہیں چاہتے۔"

قائداعظمؒ نے میرے جواب پر کہا "کیا فضول بات ہے۔ میں تمہیں تمغہ دینا چاہتا ہوں اور تم کہتے ہو کہ دینا نہیں چاہتے۔"

میں نے کہا: "اگر آپ تمغہ دینا چاہتے ہیں تو ایسا دیجیے جو اس سے پہلے کسی کو نہ دیا ہو۔"

کہنے لگے: "اچھا تو کہو۔"

میں نے کہا: "آپ اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیجیے۔"

وہ بولے "What nonsense?" ایک تو سرٹیفکیٹ دوں اور پھر اپنے ہاتھ سے لکھ کر دوں!

میں نے کہا: "یہ تو آپ کو اپنی تحریر ہی میں دینا پڑے گا۔"

کہنے لگے: "اچھا کل آجانا۔"

اگلی صبح میں گیا تو سرٹیفکیٹ تیار تھا۔ میں نے دیکھا تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انھوں نے کہا کہ پڑھو! مگر کون پڑھتا۔ خوشی کے مارے میرا برا حال تھا۔ میں نے بغیر پڑھے کہا۔ ٹھیک ہے!

قائداعظمؒ بولے "ٹھیک ہے یا اور لکھ دوں!"

میں نے کہا کہ "کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بہت کافی ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ!"

اس سرٹیفکیٹ پر مقام سیسل ہوٹل اور تاریخ یکم جولائی ۱۹۴۴ء پڑی ہے اور یہ ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔

پاکستان بنا تو قائداعظمؒ گورنر جنرل ہوگئے۔ نومبر یا دسمبر میں وہ لاہور آئے تو میں ان سے ملنے کے لیے ان کے پاس پہنچا۔ اپنا کارڈ بھیجا تو فوراً اندر بلوا لیا گیا۔ مس جناح قائداعظمؒ کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ قائداعظمؒ نے پوچھا کہ تم بہت پریشان معلوم ہوتے ہو۔ کیا بات ہے؟ میں نے انھیں بتایا کہ میرا خاندان انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں

پاکستان پہنچا ہے۔ لیکن پریشانی کی بات یہ ہے کہ میری بہنیں، بہنوئی اور ان کے بچے لکھنؤ کی ایک کالونی میں پھنسے ہوئے ہیں اور انہیں نکالنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میرے کزن نام حسین دہلی میں پاکستان کے ہائی کمشنر ہیں لیکن وہ بھی کچھ نہیں کر سکے۔"

قائدِ اعظمؒ نے کہا "واقعی یہ بہت پریشانی کی بات ہے۔ لیکن قوموں کو اپنے وجود کے تحفظ کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ ہمیں ان صعوبتوں سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ جہاں تک ہو سکے صبر و تحمل سے ان کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔"

قائدِ اعظمؒ سے رخصت ہو کر میں خاموشی سے گھر چلا آیا۔ دو تین دن کے بعد قائدِ اعظمؒ کے پرائیویٹ سیکرٹری کا ٹیلیفون میرے پاس آیا کہ ایئر فورس کا ایک جہاز لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے نام قائدِ اعظمؒ کا خط لے کر جا رہا ہے جس کے ساتھ میں بھی جا سکتا ہوں اور اپنی بہنوں وغیرہ کو لانے کا انتظام کر سکتا ہوں۔

مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں والٹن ہوائی اڈے پر پہنچا۔ جبکہ جہاز کو ایئر فورس کے ہوائی اڈے سے روانہ ہونا تھا۔ چنانچہ ہوائی جہاز میرا انتظار کیے بغیر وقت مقررہ پر روانہ ہو گیا۔ میں جب قائدِ اعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری کے پاس پہنچا اور انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ پریشان ہو گئے۔ اور کہا کہ قائدِ اعظمؒ کو معلوم ہوا تو وہ سخت ناراض ہوں گے۔ ان کا حکم تھا کہ جہاز آپ کی بہنوں کو لیے بغیر واپس نہ آئے۔

قریب ہی قائدِ اعظمؒ کا ایک اے ڈی سی بیٹھا تھا جو نیوی کا ایک نوجوان افسر تھا۔ اس نے کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں ابھی انتظام کرتا ہوں آپ اپنی بہنوں کے پتے فراہم کیجیے۔" پھر انہوں نے دہلی میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اے ڈی سی سے ٹیلیفون پر بات کی۔ اور انہیں تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اور میری بہنیں اسی جہاز سے پاکستان پہنچیں۔ اس طرح قائدِ اعظمؒ نے مجھ جیسے حقیر انسان کے ساتھ اتنی مہربانی کی جو اس منصب کے کسی شخص سے متوقع نہیں ہوتی۔ عام لوگوں سے انکا محبت اور تعلق نے ہی انہیں بابائے قوم کا درجہ دیا۔

عبدالحمید

قائدِ اعظمؒ زیارت میں

قیامِ پاکستان کے بعد قائدِ اعظم دو مرتبہ زیارت تشریف لائے۔ پہلی مرتبہ ان کا قیام ریذیڈنسی کے اس حصے میں تھا جس میں ایجنٹ گورنر جنرل (اے۔ جی۔ جی) ٹھہرا کرتے تھے اس زمانے میں اے جی جی مسٹر ڈنڈاس تھے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اور قائدِ اعظمؒ دونوں قامت اور جثے میں دبلے پتلے اور لمبے تھے۔ قائدِ اعظمؒ جب ان دونوں کے درمیان چلتے ہوئے پولیس کی جانب آتے تو مجھے عجیب سا احساس ہوتا۔

قائدِ اعظمؒ پاکستان بننے سے بہت پہلے کرنل عبدالغنی کے زمانے میں بھی ریذیڈنسی میں ٹھہر چکے تھے۔ زیارت کو شاید وہ اسی لیے پسند کرتے تھے کہ یہ ایک الگ تھلگ جگہ تھی۔ یہاں صنوبر کے بہت سے درخت ہیں اور نہایت ہی پرفضا مقام ہے۔ انسان یہاں رہ کر بے حد سکون محسوس کرتا ہے۔ صنوبر دلکش تو ہوتے ہی ہیں، صحت پر بھی خوشگوار اثر ڈالتے ہیں۔

قائدِ اعظمؒ دوسری مرتبہ زیارت میں اگست ۱۹۴۸ء میں آئے تھے۔ پہلے دو چار دن وہ کوئٹہ میں رہے۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ بہت کمزور ہو گئے تھے زیارت آکر ان کی صحت نسبتاً بہتر ہو گئی۔ وہ صحت یاب ہو رہے تھے لیکن اسٹیٹ بینک کے افتتاح کے سلسلے میں انھیں کراچی جانا پڑا۔ کراچی سے جب وہ دوبارہ

زیارت پہنچے تو بہت زیادہ کمزور نظر آتے تھے۔ اس کی وجہ شاید کام کی زیادتی تھی۔
جب قائد اعظمؒ زیارت پہنچے تو مس فاطمہ جناح کے کہنے پر بریگیڈیئر ایم آر خان نے وہاں کے کیمپ کا کام میرے سپرد کر دیا۔ اور اس طرح مجھے ان کے قریب رہنے اور ان کی خدمت کرنے کا موقع ملا۔
قائد اعظمؒ حالانکہ بیمار تھے اور علاج اور آرام کے لیے زیارت آئے تھے۔ لیکن سرکاری کام انہوں نے یہاں بھی ترک نہیں کیا۔ قائد اعظمؒ کے سیکرٹری کرنل ایس بی شاہ وقت مقررہ پر آپ کی خدمت میں روزانہ آتے اور کام بارہ بجے ختم ہو جاتا تو کرنل واپس چلے جاتے تھے۔ قائد اعظمؒ زیارت ریذیڈنسی میں ایک مخصوص بالکونی میں کرسی پر بیٹھتے تھے۔ اس بالکونی کے سامنے کا منظر انہیں بے حد پسند تھا۔ وہ اکثر اس منظر سے لطف اندوز ہوتے۔ ایک دن کرنل شاہ سے فرمایا!
"اچھا ہو اگر لوگ یہ راستہ استعمال نہ کریں۔ اس لیے کہ یہاں بیٹھ کر میں صرف مناظر سے ہی لطف اندوز نہیں ہوتا بلکہ کچھ اہم باتیں بھی سوچتا ہوں۔ اگر ایسے میں کوئی رکاوٹ ہو تو میری توجہ بٹ جاتی ہے اور سوچ کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔" چنانچہ کرنل ایس بی شاہ خود بھی وہ راستہ استعمال نہ کرتے۔ انہوں نے احکامات جاری کر دیئے تھے کہ کوئی شخص اس راستے پر نہ چلے۔
ایک دن قائد اعظمؒ نے مجھے پیغام بھجوایا کہ وہ جمعرات کو ۱۰ بجے صبح نیچے آ کر ریذیڈنسی کا باغ اور نرسری دیکھیں گے۔ ہم لوگ مقررہ وقت سے کچھ دیر پہلے تیار ہو گئے اور سارا عملہ قائد اعظمؒ کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ ابھی ۱۰ بجنے میں سترہ منٹ باقی تھے کہ قائد اعظمؒ کے اردلی نے اطلاع دی کہ قائد اعظم کی طبیعت مضمحل ہے اس لیے وہ نہیں آ سکیں گے۔ اس دن کے بعد سے قائد اعظمؒ کی صحت گرتی گئی اور ہم نے انہیں پھر نیچے آتے نہیں دیکھا۔ آخری مرتبہ جب زیارت سے کوئٹہ روانہ ہونے لگے تو انہیں اسٹریچر پر لایا گیا۔ روانگی کے وقت قائدؒ نے حکم دیا کہ مجھے اسٹریچر پر لے جاتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا جائے کہ کوئی

انگریز میری یہ حالت نہ دیکھے۔ اتفاق سے ریذیڈنسی میں اس وقت صرف ایک ہی انگریز افسر تھا؛ مسٹر ڈی ایم اسکاٹ؛ جو شاید پولیس کپتان تھا۔ اور سیکیورٹی کا نگران تھا۔ میں نے اس سے جا کر کہا کہ قائد اعظم آنے والے ہیں آپ باہر جا کر سیکیورٹی کے انتظامات کا جائزہ لیں۔ وہ سمجھدار افسر تھا نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ اور اپنے آدمی کی ڈیوٹیاں چیک کرنے لگا۔

جب قائد اعظم کو کار میں بٹھایا جانے لگا تو فرمایا کہ "مجھے کار میں اس طرح بٹھاؤ کہ میں اپنے عوام کو دیکھ سکوں"۔

جب زیارت سے روانہ ہوئے تو بابا دا اپنا ہاتھ آہستہ آہستہ ہلا کر لوگوں کو خدا حافظ کر رہے تھے۔ زیارت میں یہ ان کا آخری قیام تھا۔

حاجی عبدالکریم

آخری علالت

میں سول ہسپتال کوئٹہ میں چارج کمپاؤنڈر تھا۔ ہمارے سول سرجن ڈاکٹر صدیقی صاحب تھے۔ عام طور پر وہ باہر جایا کرتے تھے۔ میں ڈرائیور بھی تھا اور کمپاؤنڈر بھی! ایک دفعہ رات کے کوئی چار بجے تھے ٹیلی فون آیا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ سرجن صاحب نے کہا "گاڑی تیار کرو، زیارت جانا ہے، قائداعظم کا فون آیا ہے"

اسی وقت ہم گاڑی میں بیٹھ کر زیارت چل پڑے۔ صبح زیارت پہنچے۔ سول سرجن نے قائداعظمؒ کو باقاعدہ اسٹیتھو سکوپ لگا کر جانچا اور گلا دیکھا۔ پھر سرجن صاحب نے کچھ دوائیاں تجویز کرکے زیارت اسپتال سے منگوائیں اور قائداعظمؒ کو دے دیں۔ چار پانچ دن کے بعد دوپہر کے وقت پھر ٹیلی فون آیا کہ قائداعظمؒ کی بیماری بڑھ گئی ہے تو میں پھر سول سرجن کے ساتھ چل پڑا۔ ہم کچھ دور گئے جا رہے تھے۔ تقریباً سترہ میل پر جا کر گاڑی خراب ہو گئی۔ بہرحال ہم قائدؒ کی خاص جیپ میں (جو صبح کوئٹہ ڈاک پہنچاتی تھی اور شام کو واپس زیارت لاتی تھی) زیارت پہنچ گئے۔ قائداعظمؒ کو دیکھ کر اور دوا دے کر واپس آگئے تین چار دن کے بعد ہمیں پھر زیارت جانا پڑا۔

قائداعظمؒ کی طبیعت بہت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اس مرتبہ میں پھر

مریض کے ساتھ لگ گیا۔ انہوں نے بھی دوائیاں تجویز کیں اور مجھ سے کہا کہ تم قائد اعظمؒ کی
دواؤں اور کھانے کا خیال رکھا کرو۔ میں وہیں ٹھہرا رہا۔ بعد میں مرض اور بڑھ گیا۔
آر لاہور سے تین ڈاکٹر بلائے گئے جن میں کرنل الٰہی بخش کا نام مجھے یاد ہے۔ انہوں
نے قائد اعظمؒ کو دیکھا اور کچھ دوائیاں تجویز کیں اور وہیں ٹھہر گئے اور کچھ انجکشن جو
ادھر پاکستان میں نہیں ملتے تھے باہر سے منگوائے۔

قائد اعظم کی بیماری بڑھتی گئی۔ ڈاکٹر اس بات پر زور دیتے تھے کہ آپ
مہربانی کر کے کچھ دیر آرام کیا کریں۔ لیکن وہ کام بہت کرتے تھے۔ اور کہتے تھے
کہ اس وقت پاکستان کی خدمت زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ پاکستان نیا نیا بنا ہے۔ بعد
میں قائد اعظمؒ کی بیماری اور بڑھ گئی۔ ٹمپریچر زیادہ ہو گیا اور کھانسی بھی بڑھ گئی اور
وہ صاحب فراش ہو گئے۔ مگر وہ برابر کام کرتے رہے۔ اس دوران ایک مرتبہ
وزیر اعظم لیاقت علی خان آدھے گھنٹے کے لیے دوپہر کو آئے۔ قائد اعظمؒ سے
بات چیت ہوئی۔ پروگرام شاید یہ تھا کہ لیاقت علی خان ایک دو دن زیارت میں ٹھہریں
گے۔ لیکن وہ ملاقات کے فوراً بعد واپس چل پڑے تو ہم لوگوں نے پوچھا کہ لیاقت علی خان
کیوں جا رہے ہیں؟ قائد اعظمؒ نے کہا کہ "لیاقت علی خان کا یہاں ٹھہرنا ضروری نہیں۔ کیونکہ
سنٹرل حکومت کا کام ان کے ذمے ہے"۔ چنانچہ لیاقت علی خان واپس چلے گئے۔

قائد اعظمؒ سے تو میری بات چیت ممکن نہ تھی۔ لیکن کبھی کبھی ان کی بہن محترمہ
فاطمہ جناح سے میں بات چیت کر لیا کرتا تھا۔ صفائی کرنا، بستر بچھانا میری ڈیوٹی تھی۔
بعد میں سول سرجن صاحب نے ایک سسٹر کو بھیجا جو ان کے بستروں کی صفائی اور کپڑوں
کی دیکھ بھال کرتی تھیں اور ٹمپریچر کو بھی لکھتی تھیں۔ بعد میں قائد اعظم بہت
کمزور ہو گئے۔ اور لکھنے پڑھنے سے بھی رہ گئے۔ وہ چارپائی پر لیٹے رہتے تھے بات
نہیں کر سکتے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ پیر یا منگل کو شاید قائد اعظمؒ کراچی جائیں گے۔ لیکن
فوراً کراچی جانا پڑا۔ قائد اعظمؒ کو گاڑی سے جہاز کے پاس لے جایا گیا اور پھر اسٹریچر پر جہاز
کے اندر پہنچایا گیا۔

قائدِ اعظمؒ بیماری کے دوران ڈاکٹر کی تجویز کے مطابق کھانا کھاتے تھے۔ بعد میں میٹرن انہیں چمچوں سے کھلاتی تھی۔ ان کے لیے ایک خاص لباس بنایا گیا تھا جو صبح سویرے بدلا جاتا تھا۔ یہ کام ڈاکٹر صاحب، محترمہ فاطمہ جناح اور میٹرن کرتی تھیں۔ اس دوران دوسرے آدمیوں کو وہاں جانے کی اجازت نہ تھی۔ قائدِ اعظمؒ کے شیو کے لیے کراچی سے خاص آدمی آیا ہوا تھا۔ بیماری کے دنوں میں بہت تکلیف سے شیو کرتے تھے۔ چہرے پر جھریاں ابھر آئی تھیں۔

ایک مرتبہ میں نے مس فاطمہ جناح سے کہا کہ قائدِ اعظمؒ سے آپ ہماری سفارش کرا دیں۔ تو انہوں نے لکھ دیا کہ "عبدالکریم نے میری خدمت کی ہے۔ لہٰذا اسے خاص طور پر جگہ دی جائے۔"

طوطی خان

پھولوں کی باتیں

میں تقریباً تمام زیارت ریذیڈنسی میں مالیوں کی جمعداری کی ملازمت کو تیس سال ہو گئے ہیں۔ اس سے پہلے میرے والد صاحب یہاں چھیالیس سال ملازمت کر چکے ہیں قیام پاکستان سے پہلے ایک مرتبہ قائداعظمؒ یہاں تشریف لائے اور ایک ہفتہ قیام کیا۔ اس وقت میرے والد صاحب یہاں ملازم تھے۔ پاکستان بننے کے بعد جب قائداعظمؒ یہاں تشریف لائے تو میں موجود تھا۔

پہلے قائداعظمؒ آئے تو ایک ماہ ٹھہرے۔ بعد میں پھر ایک مہینے کے لیے آئے۔ اس طرح وہ یہاں کل دو مہینے رہے۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر بھی تھے۔ وہ کہتے تھے کہ قائداعظمؒ نے بہت محنت کر کے پاکستان بنایا ہے۔ ان کو ٹی بی کی بیماری ہو گئی ہے اور وہ علاج اور آرام کے لیے آئے ہیں۔" ڈاکٹروں نے بتایا۔ قائداعظمؒ کہتے ہیں کہ ان کی صحت یہاں آ کر ٹھیک ہو گئی ہے۔ زیارت کی آب و ہوا اور پانی اچھا ہے۔ وہ یہاں پھر آئیں گے۔

قائداعظمؒ اوپر کے کمرے میں رہتے تھے۔ کبھی وہ برآمدے میں آ کر بیٹھتے۔ دوپہر کے وقت وہ روزانہ باغیچے میں سیر کرتے۔ برآمدے میں بیٹھتے تو کبھی اخبار پڑھتے۔ کبھی کتابیں اور کبھی لکھنے کے کام میں مصروف رہتے۔

قائداعظمؒ کو پھولوں سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ ہم لوگوں سے پھولوں کے بارے میں بہت سی باتیں کرتے تھے۔ اور جو سوال پوچھتے تھے ہم ان کا بڑے ادب سے جواب دیا کرتے تھے۔ ان کا رعب بہت تھا اس لیے ہم زیادہ دیر تک ان کا سامنا نہ کرتے لیکن ہم ان سے خوف نہ کھاتے تھے کیونکہ وہ تو رحم اور محبت کے پیکر تھے۔ وہ مجھ پر یا ریذیڈنسی کے کسی اور آدمی پر کبھی ناراض نہیں ہوئے۔ وہ ہمیشہ بہت نرمی سے بات کرتے تھے۔

قائداعظمؒ کے آنے پر بہت سی قسم کے کھانے پکتے تھے۔ لیکن جب وہ بہت بیمار ہو گئے تو آخری ہفتے میں وہ صرف بٹیر کا شوربہ پیتے تھے۔ آخری دنوں میں تو ان کو کھانا نلکی کے ذریعے دیا جانے لگا تھا۔ ان کا اپنا ایک خانساماں تھا۔ دو بیرے تھے ایک خانساماں یہاں کا تھا، ایک خانساماں گورنر ہاؤس کوئٹہ سے آیا تھا۔ یہ سب مل کر کھانا تیار کرتے تھے اور بیرے کھانا لگاتے تھے۔ دو ڈاکٹر تھے جو ان کا کھانا ٹیسٹ کرتے تھے۔ ان میں ایک ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش تھے جو ہر وقت ان کے پاس رہتے تھے۔ بیماری کے زمانے میں ہم قائداعظمؒ کے لیے پھولوں کا گلدستہ لے کر آتے۔

جب قائداعظمؒ کو یہاں سے کوئٹہ لے جانے کا فیصلہ ہوا تو ان کو اوپر سے اسٹریچر پر لایا گیا اور گاڑی بالکل سامنے لگا دی گئی۔ خیال تھا کہ ایک کرسی میں بٹھا کر ان کو گاڑی تک پہنچایا جائے گا لیکن وہ کرسی پر بیٹھ کر موٹر میں سوار نہیں ہو سکتے تھے۔ جب قائداعظمؒ کو کوئٹہ لے جانے کا انتظام کیا گیا تو اس وقت ہم لوگ سمیت کوئی آدمی ان کو نزدیک سے نہیں دیکھ سکا۔ کیونکہ حفاظتی عملے کسی کو بھی قریب نہیں آنے دیا۔ میں نے دور سے ان کا منہ اور ان کے ہاتھ کھلے ہوئے دیکھے تھے۔

انگریز کے زمانے میں جب قائداعظمؒ زیارت آئے تو سردار مراد خان ان سے ملے آئے تھے۔ قائداعظمؒ نے پوچھا کہ "یہاں سب خشک پہاڑ اور چٹانیں ہیں اب

لوگوں کا گزارا کیسے ہوتا ہے؟" انھوں نے جواب دیا کہ "ہم لوگ بھیڑ بکریاں پالتے
ہیں۔ ان کے دودھ کی لسی چاول میں ڈال کر کھاتے ہیں۔ اس پر ہی ہمارا گزارا
ہے۔" قائداعظمؒ نے کہا: "امید ہے کہ پاکستان بن جائے گا۔ اور پھر آپ لوگوں کو
اتنی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہم اس کو غلہ پہنچائیں گے۔"

جب پاکستان بن گیا تو مراد خان اور دوسرے سردار صاحبان قائداعظمؒ کے
پاس آئے۔ اور ان کو یاد دلایا کہ آپ نے اس علاقہ کو سرسبز بنانے کو کہا تھا۔ قائداعظمؒ
نے حکم دیا کہ پہاڑوں کا پانی نیچے جھیل میں جمع کیا جائے تاکہ پینے کے لیے اور کھیتوں
کیاریوں کے لیے پانی زیادہ مقدار میں مل سکے۔ اور انھوں نے یہ بھی حکم دیا تھا
کہ ندی نالوں کا پانی مشینوں کے ذریعے جمع کر کے پینے کے لیے اور فصلوں کے
لیے تقسیم کیا جائے۔ قائداعظمؒ کے حکم کے مطابق ان اسکیموں کا سروے بھی ہو چکا
تھا۔ لیکن جب قائداعظمؒ کا انتقال ہو گیا تو کسی نے اس کا کوئی خیال نہ کیا۔ اور سب
کام پڑا رہ گیا۔

ان کے زمانے میں ریذیڈنسی میں بہت بڑا لنگر تھا۔ ہمیں اور ہمارے بال بچوں
کو کھانا یہیں سے ملتا تھا۔ افسروں اور بڑے لوگوں کے لیے الگ لنگر تھا۔ ہر آنے
جانے والے مہمان کو قسم قسم کا کھانا اور چائے وغیرہ ملتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ہم
سب نوکروں کو ایک جوڑا کپڑا بھی ملتا تھا۔

میر محمد خان

سب بچے میرے ہیں

میں ڈاکٹر اعظم کے پاس ۱۹۶۰ء میں ملازم ہوا۔ وہ لندن سے پڑھ کر تشریف لائے
تھے۔ ان کو بیرے کی ضرورت تھی۔ پینتالیس امیدوار پہنچے۔ بہت سے لوگوں نے
کوشش کی۔ کچھ لوگوں کے پاس سفارش تھی مگر ڈاکٹر اعظم سفارش نہیں مانتے تھے۔ میرے
پاس ستر سال کا تجربہ تھا۔ انھوں نے مجھے ملازم رکھ لیا۔ اور کہا کہ تم اپنے ساتھ ایک بیرا
رکھ لو۔ کیونکہ کام زیادہ ہوگا اور تمہیں میرے پاس رہنا ہوگا۔ میں ان کے ساتھ کراچی گیا
وہ بہت ہلکی غذا کھاتے تھے جیسے یخنی سوپ وغیرہ۔ وہ صبح ۵ بجے کے قریب
بیڈ ٹی پیتے۔ پھر شیو کرتے۔ اس کے بعد کپڑے پہنتے۔ اور ۶ بجے ناشتہ کرتے تھے
ناشتہ کرتے ہی کام شروع کر دیتے اور ۱۲ بجے فارغ ہو کر ایک بجے کھانا کھاتے۔ ۵ بجے
تک آرام کیا کرتے۔ ۵ بجے چائے پی کر ۸ بجے رات کھانا کھاتے۔ اس کے بعد کوئی
کتاب پڑھتے یا لوگوں سے ملتے یا اپنی بیوی سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ رات ۱۰ بجے
ان کا سونے کا وقت ہو جاتا۔ ان کا برتاؤ بہت اچھا تھا۔ اپنے نوکروں کو بچوں کی

درس سمجھتے تھے اور محبت سے پیش آتے تھے۔ انہوں نے کبھی غصے سے بات نہیں
کی۔

قائداعظمؒ کو پاکستان اور دنیا بھر کے مسلمانوں سے بہت زیادہ محبت تھی۔
میں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ میں نے زیارت میں ایک بار اپنی غربت کی وجہ سے کہا کہ آپ
ہمارے بچے کی فیس معاف کروانے کے لیے ایک خط لکھ دیں۔ تو انہوں نے مجھ سے
پوچھا کہ تمہارے بیٹے کا ماہوار خرچہ کتنا ہے؟ میں نے کہا کہ میرے بیٹے کا خرچہ تیس روپے
ماہوار ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ تیس روپے میں اپنی جیب سے دیا کروں گا۔ کیونکہ اگر
میں فیس معاف کرنے کا خط لکھ دوں گا تو پھر سب کی فیس معاف کرنی ہوگی۔ اور پاکستان
کے سب بچے میرے بچے ہیں۔

ایک بار قائداعظمؒ ایک صاحب سے باتیں کر رہے تھے کہ ہم نے مسلمانوں کے
لیے ایک ملک بنایا۔ اب یہاں کے مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ اس ملک کو بنائیں۔ میں
شاید اور دو ماہ تک زندہ رہ سکوں گا یا نہیں! اور پھر ٹھیک دو مہینے بعد قائداعظمؒ
اللہ کو پیارے ہو گئے۔

کوئٹہ میں قائداعظمؒ زیادہ بیمار ہوئے تو ڈاکٹروں نے آپس میں مشورہ کیا
اور انہیں کوئٹہ سے کراچی لے آئے۔ ایک دن قائداعظمؒ نے مجھے بلایا اور کہا "تم میرے
لیے کھانے کا انتظام کرو اور کسی کو اندر مت آنے دو۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔" کچھ
دیر بعد کھانے تو میں اندر گیا تو بولے "کھانا لاؤ۔" اور پھر آٹھ بجے میں سب سے الگ
انہوں نے پیا اور کہنے لگے۔ "مجھے لٹا دو۔" میں نے ان کو لٹا دیا۔ اس کے بعد مجھے
نرس نے کہا کہ تم ڈاکٹر کو ٹیلی فون کرو کیونکہ قائداعظمؒ کے پاؤں ٹھنڈے ہو گئے ہیں
میں نے ٹیلی فون کیا اور ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش صاحب آ گئے۔ انہوں نے نبض کو دیکھا تو
مجھے کہا کہ دوا انجکشن لاؤ۔ میں دوا انجکشن لایا۔ وہ قائداعظمؒ کی چارپائی کے نیچے رکھ دیں
پھر ڈاکٹر صاحب نے قائداعظمؒ کی بہن محترمہ فاطمہ جناح کو بلایا اور کہا "میں افسوس
سے کہتا ہوں کہ چند منٹ پہلے قائداعظمؒ کا انتقال ہو گیا ہے۔" پھر سب لوگ رونے لگے۔

کریم بخش

ناشتہ اور کتاب

جب قائداعظمؒ کا قیام زیارت میں تھا۔ تو میں بھی ان کے لیے خانساماں اور بیرے کا کام کرتا تھا۔ وہ ہم لوگوں کے ساتھ بڑی ہمدردی کرتے تھے۔ وہ یہاں ڈھائی مہینے رہے۔ ان دنوں محترمہ فاطمہ جناح نے اور بکرے ذبح کروائی تھیں اور گوشت ہم غریبوں میں تقسیم ہوتا تھا۔ وہ کپڑوں کی گٹھڑیاں ساتھ لے کر غریبوں میں تقسیم کرتیں۔ یہاں لوگوں کے پاس کپڑا نہیں ہوتا تھا اور ان دنوں تو کپڑے پر بھی کنٹرول تھا۔ قائداعظمؒ اور محترمہ فاطمہ جناح کو زیارت والوں سے بہت ہمدردی تھی میں پاکستانی کھانا بناتا تھا اور دوسرے بیرے انگریزی کھانے بناتے تھے۔ میز پر کھانا لگانا دوسرے بیرے کی ڈیوٹی تھی۔ میرا کھانا بھی میز پر ہوتا تھا اور قائداعظمؒ کو بتایا جاتا تھا کہ زیارت والے خانساماں نے یہ کھانا بنایا ہے۔ میں مرغی کا سوپ، روسٹ اور قورمہ بناتا تھا۔ شامی کباب اور پلاؤ بناتا تھا۔ قائداعظمؒ سوپ پسند کرتے تھے اور ہر کھانا چکھتے تھے۔ ناشتے میں قائداعظمؒ انڈے، مکھن، سلائس اور جام پسند کرتے تھے قائداعظمؒ جب کمرے سے باہر نکلتے تھے تو ان کے پاس ایک کتاب ہوتی تھی۔ بغیر کتاب کے وہ کبھی نظر نہیں آتے۔ وہ ایک خاص بنچ پر بیٹھ کر کتاب پڑھتے رہتے تھے۔ پھر بھی وہ دو گھنٹے بیٹھتے کبھی ڈھائی گھنٹے۔ اس دوران میں کوئی ادھر نہیں جا سکتا تھا۔

قائداعظمؒ اور خواتین

"مسلمان خواتین میں آج ایک نئی زندگی، امنگ، جوش اور ولولہ پیدا ہو چکا ہے۔ لہٰذا ارض کی کوئی قوم اپنی خواتین کے موثر اور فعال تعاون کے بغیر کسی قسم کی کوئی ترقی نہیں کر سکتی۔ وہ پردہ میں رہتے ہوئے مسلم لیگ کی آواز پبلک تک پہنچا سکتی ہیں۔ آپ اپنی کوششوں میں روز افزوں اضافہ کیجیے اور ضائع شدہ وقت کی تلافی کیجیے تا کہ قوم کی تعمیر نو میں مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ خدمات ادا کر سکیں۔"

خواتین کے ایک اجلاس سے کلکتہ میں خطاب

(فروری ۱۹۳۶ء)

محترمہ شیریں بائی

میرے بھائی جان

سوال : محترمہ ! قائد اعظمؒ نہ صرف پاکستان کے سب سے بڑے ، سب سے بلند کردار اور سب سے عظیم رہنما تھے بلکہ ان کا شمار دنیا کے صفِ اول کے سیاست دانوں میں ہوتا ہے۔ ایسے روشن دماغ رہنما کی آزادئ نسواں کے بارے میں کیا رائے تھی؟

جواب : قائد اعظمؒ کو میں بھائی جان کہتی تھی لیکن جب عوام بابائے قوم کہنے لگے۔ تب میں بھائی جان کی جگہ قائد اعظم کہنے لگی۔ وہ عورتوں کی ترقی کے لیے صاف خیال رکھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ قوم کی ترقی میں عورتوں کو خاص حصہ لینا چاہیئے۔ عورتوں کو مردوں کے ساتھ کام کرنا چاہیئے لیکن مغربی زندگی کی برائیوں سے بچ کر! اور اس طرح کہ جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا۔

سوال : ان کے بچپن کا کوئی واقعہ یا کوئی ایسی یاد جس سے آپ خاص طور پر متاثر ہوئی ہوں۔ جب ایک ہی گھر میں بہت سے بچے پلے ہوتے ہیں ، پرورش پاتے ہیں تو ان کی بچپن کی بہت سی باتیں بھی ہوتی ہیں؟

جواب : ہماری والدہ ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ میرا بیٹا ایک دن راجہ ضرور بنے گا ۔ اس کے چوم ہے ۔ قائد اعظمؒ نے وہ نشان مجھے بھی دکھایا تھا۔ ہماری ماں کی آواز تھی جس نے بہت پہلے بتا دیا کہ قائد اعظم ملک کا بے تاج بادشاہ ہوگا۔

سوال: ہم نے قائد اعظمؒ کے بارے میں جو بھی پڑھا یا سنا ہے وہ زیادہ تر
بطور لیڈر یا سیاست داں کے تھا۔ آپ بطور بھائی ہمیں ان کے بارے میں بتلائیے؟

جواب: قائد اعظم سارے بہن بھائیوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ والد
کے انتقال کے بعد میں اور فاطمہ ان کے ساتھ رہتے تھے۔ فاطمہ کو کانونٹ میں داخل کروا
دیا۔ وہ عورتوں کی تعلیم ضروری سمجھتے تھے۔ اس وقت لڑکیوں کی تعلیم کا رواج نہیں
تھا۔ جب بمبئی کے اخبارات میں خبر چھپی کہ مشہور بیرسٹر محمد علی جناح کی بہن شیریں جناح
نے گھوڑا چلانا سیکھ لیا۔ بھائی جان بہت خوش ہوئے۔ میری شادی بھی قائد اعظم ہی نے
کرائی تھی۔

سوال: آپ ہمیں ان کے کوئی پسندیدہ کھانے، کھیل یا کوئی اور پسندیدہ عادتوں
کے بارے میں بتائیے؟

جواب: ان کو بریانی اور زردہ بہت پسند تھا۔ لباس میں ساڑھی زیادہ پسند تھی۔

بیگم انوار حمیدہ ہدایت اللہ

ہمارے معزز مہمان

۱۹۳۲ء میں میرے والد گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے لندن گئے ہمیں ان کے ساتھ تھی میرے والد نے ذکر کیا تھا کہ مسلمانوں کے سب سے بڑے رہنما یعنی قائد اعظمؒ بھی لندن میں موجود ہیں۔ وہاں میرے والد نے ان سے فون پر رابطہ قائم کیا اور ملنے کی درخواست کی۔ قائد اعظمؒ نے ہمیں چائے پر مدعو کیا۔ میں نے خیال کیا کہ قائد اعظمؒ بھی مولانا محمد علی جوہر جیسے ہوں گے۔ اس سے پہلے میں نے ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر کچلو کو دیکھا تھا۔

جب ہم قائد کی قیام گاہ پر پہنچے تو انہوں نے خود بڑھ کر دروازہ کھولا جب میں نے ان کو دیکھا تو مجھ پر ان کی شخصیت کا رعب اور دبدبہ طاری ہو گیا۔ قائد اعظم ہمیں دیکھ کر مسکرائے۔ ہم سے مصافحہ کیا اور ہمیں اندر لے گئے۔ مس جناح بھی ہم سے بڑے تپاک سے ملیں۔ جب میرے والد اور قائد اعظمؒ باتیں کر رہے تھے تو ہم خاموش بیٹھے ان کی باتیں سنتے رہے۔ میرے والد نے کہا کہ میں مسلمانوں کی طرف سے ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔ وہ یہ کہ ہندوستان کے مسلمان منتشر ہو چکے ہیں مولانا محمد علی کی وفات کے بعد اب کوئی رہنما نہیں رہا اور مسلمانوں کو اس مرحلہ پر آپ کی ضرورت ہے۔

قائد اعظمؒ نے کہا: "مسلمانوں میں اب وہ جذبہ نہیں ہے جو ہونا چاہیئے میرا

اور اب یہیں قیام کرنے کا ہے۔" میرے والد نے کہا "نہیں جناب! آپ کو ہندوستان آنا ہوگا۔ ہمیں ایسے رہنما کی تلاش ہے جو گاندھی اور نہرو سے مقابلہ کر سکے۔ اور صرف آپ کی شخصیت ہی ان کا مقابلہ کر سکتی ہے کیونکہ آپ کانگریس میں رہ چکے ہیں۔ اور ان سے اچھی طرح واقف ہیں۔" والد صاحب نے قائداعظمؒ کو ہر طرح قائل کرنے کی کوشش کی۔ اس پر قائداعظمؒ نے کہا: "تم ذمہ داری لیتے ہو کہ ایسی فضا پیدا کر سکو گے کہ مسلمانوں کو دوبارہ ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جا سکے۔"

اس پر میرے والد نے کہا کہ میں تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے آیا ہوں۔ اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ واپس چلیں۔ قائدؒ نے فرمایا "میں اس پر غور کروں گا۔ اور جب آپ کینیڈا سے واپس آئیں گے تو جواب دوں گا!"

قائداعظمؒ سے جب ملاقات ہوئی تو میں اس وقت پندرہ سال کی تھی۔ میں ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئی۔ مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے نوابزادہ لیاقت علی خان بھی وہاں گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی قائداعظمؒ کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ ہندوستان واپس چلیں۔ بہرحال قائداعظمؒ ۱۹۳۵ء میں وطن واپس تشریف لے آئے۔ اس کے بعد ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کا جلسہ کراچی میں ہونا طے پایا۔ یہ بہت اہم اجلاس تھا۔

قائداعظمؒ کا خیر مقدم: جب قائداعظمؒ کراچی آئے تو مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے موجود تھی۔ ہندو حیران تھے کہ ایک رہنما کے استقبال کے لیے اتنے لوگ جمع ہیں۔ ایک اونٹ گاڑی پر قالین بچھائے گئے، اس پر کرسی رکھی گئی اور قائداعظمؒ کو اس پر بٹھا کر شاندار طریقے سے پوری کراچی کی سڑکوں پر لے جایا گیا۔ ایک طرف میرے بھائی دوسری طرف میرے شوہر کے بھائی ہاتھوں میں ننگی تلواریں لیے قائداعظمؒ کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ ہندو اپنے مکانوں پر کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ بلکہ جب انہوں نے مسلمانوں کے جذبات دیکھے تو اپنے دروازے بند کر لیے۔ غرض قائداعظمؒ کو نہایت عزت و احترام اور جوش و خروش

سے کراچی میں خوش آمدید کہا گیا۔

کراچی میں قائداعظمؒ ہمارے مہمان رہے اور شاید چار پانچ دن قیام رہا۔ وہ وقت کے بڑے پابند تھے۔ اگر انہیں سات بجے ناشتہ کرنا ہے تو ٹھیک سات بجے آ جاتے۔ ان کی خوراک بہت کم تھی۔ مگر مناسب اور بروقت خوراک کا بہت خیال رکھتے تھے۔ مصالحہ کم استعمال کرتے تھے۔ مچھلی پسند تھی، چاول اور روٹی بھی کھاتے تھے۔ ناشتہ ہمیشہ کھانے کی میز پر آکر کرتے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر باتیں کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ دوپہر کے کھانے کے "فوراً" بعد سونا نہیں چاہیے۔ کچھ وقفے سے جاکر سو جاتے اور چار بجے بیدار ہو کر چائے پیتے اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔ رات کو بھی اسی طرح کچھ دیر بیٹھتے۔ اور باتیں کرتے تھے۔

<u>میں صرف مسلمان ہوں</u>۔ ایک دن قائداعظمؒ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوئے تو ہم کئی لڑکیاں موجود تھیں۔ ہم نے سوچا کہ آج قائداعظمؒ سے پوچھیں کہ وہ کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں؟ "قائداعظمؒ شیعہ ہیں یا سنی۔ خوجہ ہیں؟" آخر ہم نے پوچھ ہی لیا۔ یکایک ان کی مسکراہٹ سنجیدگی میں بدل گئی۔ میرے خیال میں ان کو تھوڑا سا غصہ بھی آیا۔ انہوں نے کہا: "اس سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ تم کو معلوم ہے کہ میں صرف مسلمان ہوں! میں کیسے پیدا ہوا، کس طرح بڑا ہوا، یہ مجھے معلوم نہیں اور آئندہ اس قسم کے سوال مت کرنا!"

قائداعظمؒ پھولوں سے بہت رغبت رکھتے تھے۔ خاص کر گلاب انہیں بہت پسند تھے۔ بمبئی اور دہلی میں ان کے باغ میں گلاب لگایا جاتا تھا۔ ہر وقت ایک گلدستہ ان کی میز پر رہا کرتا تھا۔ میں نے اکثر دیکھا کہ وہ مالی کو ہدایت دیتے یا کبھی پوچھتے کہ یہ پھول اس طرح کیوں خراب ہو رہا ہے۔ اس کو پانی کیوں نہیں دیا وغیرہ! وہ اچھے اچھے پھول لندن سے منگایا کرتے تھے اور خوش ہو کر اپنا باغ دکھایا کرتے تھے۔ ایک ملازم ہمیشہ قائداعظمؒ کے ساتھ رہتا۔ اس کا کام بس یہ ہوتا کہ کپڑوں پر استری اور جوتوں پر پالش کرے اور کھانے، ناشتے کا وقت بتائے۔ یہ کام ان کا ملازم

ہی کیا کرتا تھا۔ ہمارے ملازم ناشتہ بنا سکتے تھے مگر وہ ان کا ہی ملازم سے کرواتا تھا۔ یہ
شخص قائد اعظمؒ کی زندگی تک ان کے پاس رہا۔

قائد اعظمؒ نہایت سنجیدہ مزاج تھے۔ میں نے انہیں کبھی مذاق کرتے نہیں دیکھا نہ ہنستے دیکھا۔ بس زیادہ سے زیادہ مسکرا دیا کرتے تھے۔ ان ایک مرتبہ ہم نے انہیں بہت خوش دیکھا۔ اس روز بارات نہ بننے کے بعد ہمارے یہاں ان کی دعوت تھی جب ان کے چلنے کا وقت ہوا تو انہوں نے مس جناح سے کہا "چلو"۔ مس جناح نے کہا کہ بیگم نے بچیوں سے ایک نظم سنانے کو کہا ہے۔ میری بھابی کی آواز سریلی تھی۔ ہم لڑکیوں نے ان کو وہ نظم سنائی۔

"ملت کے لیے آج غنیمت ہے ترا دم
اے قائد اعظم اے قائد اعظم"

بس اس موقع پر میں نے قائد اعظمؒ کو مسکراتے بلکہ ہنستے دیکھا۔ کہنے لگے "اچھا اب تک تم لڑکیوں کو یاد ہے یہ نظم؟"

ہمارے یہاں قیام کے دوران ایک مرتبہ ان کو نزلہ ہو گیا تو ڈاکٹر نے انہیں تین دن کے لیے آرام کا مشورہ دیا۔ دوسرے ہی دن میں نے ان کو باہر دیکھا تو پوچھا کہ ڈاکٹر نے آپ کو آرام کرنے کی ہدایت کی تھی۔ کہنے لگے "میں یہاں آرام کرنے نہیں آیا، کام بہت ہے اور وقت کم!"

خواتین کی اہمیت۔ قائد اعظمؒ عورتوں کی بہت عزت کرتے تھے۔ اور ہمیشہ ہی کہتے کہ ایک عورت مسلم لیگ میں آئی تو اس کے بچے اور اس کا خاندان بھی مسلم لیگ میں آئے گا۔ وہ ہمیشہ تعلیم نسواں کے لیے کوشاں رہتے۔ ان کا کہنا تھا کہ جتنی تعلیم تم حاصل کر سکتی ہو کرو۔ مسلمان عورتیں تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے رہ گئی ہیں۔

جب سے قائد اعظمؒ کی بیگم کا انتقال ہوا تھا وہ اپنی بہن مس جناح کو ہمیشہ اور ہر موقع پر اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ خواتین کو مردوں کے دوش بدوش کام

کہنا چاہیئے۔ قائداعظمؒ عورتوں کی تعلیم و ترقی کے سخت حامی تھے۔ میں نے ممبئی میں ان کی
لائبریری دیکھی جو بہت بڑی تھی۔ بعد میں مس فاطمہ جناح نے یہ لائبریری کراچی میں
منتقل کر دی۔ مگر بیشتر کتب شاید جگہ کی قلت کے سبب بکسوں میں بند رہیں۔ ان
میں سے کئی کتابیں نایاب قسم کی تھیں۔ ان میں سلاطین پر کتابیں تھیں اور پھر انگریزی میں
تفاسیر قرآن اور قانون کی لاتعداد کتب شامل تھیں۔ تاریخی کتب بھی تھیں مگر ناول
یا کہانیوں کی کوئی کتاب نہ تھی۔

اخبار پڑھنے کی تلقین۔ قائداعظم نوجوانوں سے کہا کرتے تھے کہ زیادہ
سے زیادہ مطالعہ کرو۔ ایک بار مجھ سے پوچھنے لگے "اخبار پڑھتی ہو؟" میں نے
اثبات میں جواب دیا تو بولے "شروع سے آخر تک؟" میں نے کہا "نہیں، صرف
سرخیاں" فرمایا "نہیں، اس وقت ضرورت ہے کہ ہر مسلمان نوجوان کو یہ معلوم ہونا
چاہیے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں
کہ ہم اوروں کے مقابلے میں پیچھے رہ گئے ہیں یا پھر کسی لغزش کے باعث
بھٹک تو نہیں گئے۔ اس لیے تمہیں خصوصاً اور دوسرے نوجوانوں کو عموماً میرا یہ مشورہ
ہے کہ وہ جتنا مطالعہ کتابوں اور اخباروں کا کر سکتے ہیں کریں۔ اور اخبار تو ہر مسلمان بچے
کو پڑھنا چاہیئے۔ اپنے بچوں کو بھی عادت ڈالو کہ صبح صبح اخبار پڑھیں تاکہ ہمیں محسوس
ہو کہ ہم کہاں کہاں پیچھے رہ گئے ہیں۔ ہر مسلمان لڑکے اور لڑکی کو اتنی معلومات ہونا
چاہیئے کہ وہ بحث و مباحثہ میں حصہ لے سکے۔"

قائداعظمؒ اخبارات پر نشان بھی لگایا کرتے تھے۔ ایک سرخ یا نیلی پنسل ہمیشہ ان
کے پاس رہا کرتی تھی۔ جب انہیں کوئی خبر کھٹکتی ہوتی تھی تو اس پر نشان لگا دیتے
بعد میں ان کے عملے کا کوئی فرد وہ خبر کاٹ کر رکھ دیتا۔

بیگم اے۔ آر۔ خان

آخری کرنیں

میرے شوہر اے آر خان عثمان سول سروس میں پونا میں تعینات تھے۔ اس وقت سندھ
صوبہ بمبئی میں تھا۔ قائداعظمؒ اور محترمہ فاطمہ جناح سے میری ملاقات بمبئی ہی میں ہوئی
سال تو مجھے یاد نہیں لیکن یہ قیام پاکستان سے بہت پہلے کی بات ہے۔ یہ ملاقات ٹرف
کلب میں ہوئی۔ بعد میں کئی ملاقاتیں ہوئیں اور پھر آنا جانا بھی شروع ہو گیا۔ میں قائداعظمؒ
کے گھر جاتی تو ان سے اور محترمہ فاطمہ جناح سے باتیں ہوتی تھیں۔ مگر ان سے سیاسی
موضوعات پر کبھی گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ میں آئی سی ایس افسر کی بیوی تھی اور مجھے
سیاست کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ پاکستان بننے کے بعد میرے شوہر کراچی میں تعینات
کیے گئے۔ اور قائداعظمؒ کئی بار کراچی تشریف لائے بلکہ ان کے آخری ایام تو زیادہ
تر کراچی میں ہی بسر ہوئے۔

کراچی میں قائداعظم سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ لیکن یہ ملاقاتیں کھانے پر
یا کسی دعوت میں ہوتی تھیں۔ وہاں کوئی خاص بات نہیں ہو سکتی تھی۔ اکثر میں
ان کی مزاج پرسی کے لیے جاتی تھی۔ وہ مجھ سے زیادہ تر پٹھانوں کے بارے میں
گفتگو کرتے۔ کیونکہ میں بھی پٹھان ہوں۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ مجھے پٹھانوں کا خلوص
اور وفاداری بہت پسند ہے۔ پٹھان مخلص اور سخت مزاج ـــ ہوتے ہیں

پھر میں ان کی علالت کے دوران کم و بیش ڈیڑھ ماہ تک زیارت میں ان کے پاس رہی۔ ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کو قائداعظمؒ زیارت سے کوئٹہ آگئے۔ میں بھی ان کے ساتھ آگئی۔ وہ ۱۴ اگست کو زیارت میں نہیں رہنا چاہتے تھے بلکہ اپنی تقریر کوئٹہ سے کرنا چاہتے تھے۔

زیارت میں جب قائداعظمؒ کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو میں اور محترمہ فاطمہ جناحؒ ان کی تیمارداری کرتے۔ ان کو چکن سوپ پلا دیتے۔ دوا وغیرہ کا وقت دیکھتے رہتے۔ زیادہ تر ہمارا کام حاضر باشی تھا۔ ہر وقت ان کے قریب موجود رہنا۔

قائداعظمؒ مسور کی دال اور بھگارے بینگن بہت پسند کرتے تھے لیکن بمبئی طرز پر تیار کی ہوئی بریانی ان کو بہت مرغوب تھی۔ جلیبیاں بھی بہت پسند تھیں۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ بریانی پکا کر کھلاؤ۔ میں نے جواب دیا کہ یہ تو ایسے نہیں ہوگا۔ آپ میرے ہاں تشریف لائیں تو میں پکا کر کھلاؤں گی۔ اس کے بعد وہ بہت بیمار ہو گئے۔ ایک دن پھر انہوں نے فرمائش کی۔ میں نے جلیبیاں تیار کیں جو انہوں نے شوق سے کھائیں۔

جب ۱۴ اگست کی تقریبات کے سلسلے میں وہ کوئٹہ تشریف لائے تو کہا کہ میں بیگم اے آر خان کے ہاتھ کا حلوہ پوری کھانا چاہتا ہوں۔ لیکن جب انہوں نے اپنے معالج کرنل الٰہی بخشؒ سے پوچھا تو انہوں نے اجازت دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ دونوں چیزیں بہت ثقیل ہیں۔ آپ کو گیس کی تکلیف ہو جاتی ہے۔ اس پر قائداعظمؒ نے کہا: نہیں بیگم اے آر خان کے ہاتھ کا حلوہ پوری مجھے نقصان نہیں دیتا۔ میں ہمیشہ کھا لیتا ہوں۔ اس پر کرنل الٰہی بخشؒ نے کہا کہ اچھا تھوڑا سا کھا لیجئے زیادہ نہیں۔ لہٰذا قائداعظمؒ کا اے ڈی سی میرے گھر آیا اور کہا کہ قائداعظم آپ کے ہاتھ کا حلوہ پوری کھانا چاہتے ہیں۔ میں نے وہیں پوریاں اور حلوہ تیار کر کے جلدی سے بھیج دیا۔ قائداعظم نے کھا کر اپنے معالج کرنل الٰہی بخش سے اس کا تذکرہ کیا۔

کرنل صاحب نے پوچھا آپ نے کتنی پوریاں کھائی تھیں؟ تو کہنے لگے سب کھا لیں کرنل صاحب نے اپنی کتاب میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے اور تعجب ظاہر کیا ہے کہ اتنی ثقیل پوریاں قائداعظم کیسے ہضم کر گئیں؟ قائداعظم کہا کرتے تھے کہ جلیبیاں یا حلوہ پوری جو تم نے تیار کی تھا بڑے مزے کا تھا۔ مجھے بہت پسند آیا۔

۲۴ اگست کو جب قائداعظم کوئٹہ آئے تو میں بھی وہاں آگئی۔ پھر وہاں سے واپس زیارت جاتے ہوئے انہوں نے فاطمہ جناح سے میرے بارے میں کہا کہ اسے بھی ساتھ لے چلو۔ اس کی موجودگی سے تم کو یہ فائدہ پہنچے گا کہ ایک ساتھی موجود ہے گا۔ لہٰذا میں پولن کر کے زیارت چلی گئی۔ وہاں اوپر ریذیڈنسی میں قائداعظم قیام پذیر تھے اور نیچے میں بنگلے کے ساتھ رہتی تھی۔

قائداعظم میرے شوہر سے بہت خوش تھے۔ ان سے ہنسی خوشی باتیں کرتے اور کبھی کبھی ڈانٹتے بھی تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ قائداعظم نے میرے شوہر سے کہا کہ تم ریذیڈنٹ کمشنر ہو پیسہ نہیں نکالتے (استعمال نہیں کرتے) دیکھو میں ریذیڈنسی میں مقیم ہوں۔ اور اس کے صوفوں کی حالت یہ ہے کہ غلافوں میں سوراخ ہو گئے ہیں"۔ میرے شوہر نے جواب دیا کہ ریذیڈنسی اے جی جی کی عمارت ہے۔ اس کی نگرانی مرمت اور درستی کا کام بھی اس کے ذمے ہے۔

اس واقعے پر میں بہت خوش ہوئی۔

قائداعظم میرے بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ میری بڑی لڑکی کے بارے میں تو وہ کہا کرتے تھے کہ اس کی شادی میں خود کروں گا۔ ایک دن مجھ سے پوچھا کہ تم اس لڑکی کو کس طرح پرورش کرو گی؟ میں نے کہا کہ تھوڑا سا پڑھاؤں گی پھر سولہ سترہ سال کی عمر میں شادی کر دوں گی۔ ہمارا دستور یہی ہے۔ کہنے لگے میں تو اس وقت تک زندہ نہیں رہوں گا۔ کاش کہ میں اس وقت تک زندہ رہتا۔ اور اس کی شادی خود کرتا یا شادی میں شریک ہوتا۔ بعد ازاں ان کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح نے میری بچی کی شادی خود کی۔

قائداعظمؒ گھریلو امور پر بھی گفتگو کرتے تھے۔ مجھ سے پوچھتے بیگم اور فاطمہ کیا
باتیں کر رہی تھیں۔ یقیناً "کپڑوں اور دوپٹوں وغیرہ کی باتیں ہو رہی ہوں گی؟"
میں نے جواب دیا "دوپٹوں کے علاوہ ہم دوسری باتیں بھی کرتے ہیں"۔ محترمہ
فاطمہ جناح کہتی تھیں کہ تم کچھ اور کام یعنی سماجی فلاح و بہبود کا کام بھی کیا کرو۔
مگر میں کیا کروں، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ کھانا پکانا اور بچوں کی پرورش
نہایت ضروری ہے۔"

میرے چھوٹے چھوٹے تین بچے تھے۔ ان کی نگہداشت اور گھر کے کام
کاج سے بمشکل فرصت ملتی تھی۔ لیکن قائداعظم اور فاطمہ جناح کے کہنے پر
میں نے بچوں ہی کے لیے کچھ کام شروع کر دیا۔ یعنی بچوں کے لیے فنڈ جمع کیا
مینا بازار لگوائے۔ اس کی آمدنی بھی بچوں کے فلاح و بہبود کے فنڈ میں دی۔
قائداعظمؒ نے پسندیدگی کے طور پر اس کام پر مجھے ایک سند عنایت فرمائی۔

حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم نہایت نرم دل اور شفیق تھے۔ مزاج قدرے
سخت تھا مگر محبت کرنے والے انسان تھے۔ کبھی کبھی ضد بھی کرتے۔ علالت
کے دنوں میں مریض کا پرہیز کرتے کرتے اکتا جانا اور چڑچڑا ہو جانا قدرتی بات
ہے۔ مگر وہ عموماً یہ نہیں کہتے تھے کہ میں یہ کھاؤں گا یا نہیں کھاؤں گا، یہ پیوں
گا یا نہیں پیوں گا۔ وہ ڈاکٹروں کی ہدایت پر پوری طرح عمل کرتے تھے۔ لیکن
آخری دنوں میں ایسا ہوا کہ صبح ناشتے پر انھوں نے کئی دن ملازموں سے
سرد انڈا منگوا کر کھایا۔ روزانہ سرد انڈا کھانے سے ان کو زکام ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے
سرد انڈا منع کر رکھا تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے دو تین دن کھایا تو علالت
بڑھ گئی۔ اس کو بدپرہیزی کہہ لیجیے یا ان کا شوق! طویل علالت اور کثرت
پرہیز غالباً اس کی وجہ تھی۔

قائداعظمؒ مجھ پر بہت شفقت فرماتے تھے شاید میرے والد سے
بھی زیادہ۔ مجھے اپنے والد کی محبت تو معلوم ہی نہیں۔ کیونکہ میں تین چار سال

کی تھی جب ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ قائداعظمؒ ہی کو میں نے ایسا شخص پایا جن
کی شفقت مجھے سب سے پہلے نصیب ہوئی۔

قائداعظمؒ نے میرے شوہر کو سونے کا ایک یادگار تحفہ دیا جو میرے پاس
محفوظ ہے۔ بعد میں انہوں نے میرے شوہر کو سونے کے فاؤنٹین پین اور پنسل کا
سیٹ بھی دیا۔ پھر کف لنکس دیئے۔ وہ بھی ہمارے پاس ہیں۔ یہ تو میں بتا ہی
چکی ہوں کہ جب میری بیٹی کی شادی ہوئی تو قائداعظم حیات نہیں تھے لیکن
۱۹۴۴ء میں ان کو علی گڑھ میں جو گجرے کا ہار پہنایا گیا تھا میری لڑکی کی شادی پر
محترمہ فاطمہ جناح نے وہی ہار میرے داماد کو پہنایا۔ یہ سب چیزیں میرے
پاس محفوظ ہیں۔ ویسے تو ان کی الماری اور اس میں رکھی ہوئی بے شمار چیزیں
... رومال، ٹائیاں، سوٹ اور بہت سی دوسری چیزیں، جو سب ہمارے
پاس محفوظ ہیں۔

قائداعظمؒ بہت مصروف آدمی تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ان کے
ذمے بہت کام آ پڑا تھا۔ مہاجرین کا مسئلہ، پاکستان کے چھوٹے سے چھوٹے
معاملوں سے لے کر بڑے سے بڑے معاملات تک، سب ان کی توجہ کا مرکز
ہوتے اور وہ دن رات کام کرتے تھے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ میں قائداعظمؒ کے بائیں جانب بیٹھی ہوئی تھی۔ میرا
نیپکن (رومال) ساڑھی سے ڈھلک کر نیچے گر گیا اور قائداعظمؒ نے اسے اٹھا
کر مجھے دیا۔ دوسری بار پھر نیپکن سرک گیا۔ قائداعظمؒ نے دوبارہ اٹھا کر دیا
ان کا اٹھانا تھا کسی نے دیکھا نہیں۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ اب اگر ایسا ہوا
تو وہ مجھے ڈانٹیں گے۔ چنانچہ تیسری بار میں نے اسے ساڑھی میں اڑس لیا۔
تاکہ گرنے نہ پائے۔

قائداعظمؒ جب بیمار ہو کر زیارت گئے تو کہا کرتے کہ اب میرا وقت
بہت تھوڑا ہے۔ میں کہتی "نہیں، آپ ایسی باتیں نہ کہا کیجیے۔" تو وہ پھر

یہی جملہ دہراتے۔ گویا قائد اعظم کو یقین تھا کہ ان کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ اسی لیے انہوں نے کسی بیرونی ڈاکٹر پر پاکستان کا روپیہ ضائع کرنا پسند نہ فرمایا۔ صرف کرنل الٰہی بخشؒ ہی ان کے معالج تھے۔ قائد اعظمؒ آخر وقت تک بہت کام کرتے تھے جب کمزوری، تھکن اور غشی وغیرہ ہو جاتی تو کام کرنا ترک کر دیتے تھے لیکن طبیعت سنبھلتے ہی پھر کام شروع کر دیتے۔ جس شخص کو یہ احساس ہو کہ قوم کا روپیہ بے جا پر خرچ نہ ہو جائے وہ باہر سے ڈاکٹر کیسے بلاتا۔ وہ گورنر جنرل تھے لیکن گورنر جنرل کی تنخواہ نہیں لیتے تھے۔ وہ اپنی جیب سے ہی کھاتے پیتے تھے۔

میں ذاتی طور پر ۱۳ تاریخ کو بھی کوئی نیا کام نہیں کرتی تھی۔ چنانچہ جب قائد اعظمؒ نے ۱۳ اگست کو کراچی جانے اور ۱۴ اگست کو وہاں سے قوم کو پیغام دینے کا ارادہ کیا تو میں نے مخالفت کی۔ میں نے کہا تیرہ کو نہیں، بارہ کو چلئے یا چودہ کو! انہوں نے کہا نہیں، مجھے قوم سے خطاب کرنا ہے میں تیرہ تاریخ کو کراچی ضرور جاؤں گا۔ بالآخر میں صبح دس بجے اور قائد اعظم ساڑھے گیارہ بجے زیارت سے روانہ ہوئے۔

قائد اعظمؒ کو کبھی کبھی غصہ بھی آتا تھا۔ خود میں نے انہیں کئی بار غصے میں دیکھا ہے۔ جب وہ ناراض ہوتے تو ان کی آواز قدرے بلند ہو جاتی۔ ویسے بھی ان کی آواز نہایت گرجدار تھی۔ نقاہت کی حالت میں بھی آواز بلند ہو جاتی۔ گھر میں وہ کبھی غصہ نہیں کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ غصہ کرنا جانتے ہی نہیں۔ وہ صرف مسکراتے ہی نہیں تھے بلکہ کبھی کبھار کھلکھلا کر بھی ہنستے تھے۔ کام سے فارغ ہوتے تو کہتے کہ اب میں اتنی دیر تک کام کی نہیں صرف کھیل کود اور ہنسی خوشی کی باتیں کروں گا۔ وہ ہنسنے ہنسانے کے چھوٹے چھوٹے قصے بھی سناتے۔ بچے سامنے ہوں تو ان کو کھیلتا کودتا دیکھ کر نہال ہو جاتے اور ان کی باتوں سے دلچسپی لیتے تھے۔

بیگم حاتم بھائی طیب جی

بیداریٔ نسواں کے علمبردار

میرے والد کو کراچی کی نسبت سے قائد اعظم کے بچپن کا ساتھ تھا۔ میں نے بچپن میں ان سے پہلی (دکان) میں ملی تھی۔ لہٰذا انہیں چچا کہتی تھی۔ پھر جسٹس بدرالدین طیب جی کے صاحبزادے سے میری شادی ہو گئی اور میں بمبئی آ گئی۔ اس خاندان سے بھی قائد اعظم کے نہایت دوستانہ تعلقات تھے۔ لہٰذا وہ میرے سسرال میں بھی آتے جاتے تھے۔ دراصل بمبئی میں مجھے قائد اعظم سے ملنے اور قریب سے دیکھنے کے زیادہ مواقع ملے۔ میرے شوہر قائد اعظم کی پارٹی بمبئی ہوم رول لیگ میں تھے اور بعد میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ چونکہ ۱۹۳۹ء سے تمام مسلمان انہیں قائد اعظم کہنے لگے تھے تو میں نے بھی انہیں چچا کی بجائے اسی لقب سے پکارنا شروع کر دیا تھا۔

قائد اعظم مجھ سے بیٹیوں جیسا برتاؤ کرتے تھے۔ وہ ہم سب سے محبت کرتے اور ہم سب ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ وہ بزرگوں کی طرح ہم سے شفقت سے پیش آتے تھے۔ ان کا بے حد باوقار انداز تھا۔ ان سے ہنسی مذاق کی ہمیں جرأت نہیں ہوتی تھی مگر بات چیت میں وہ نہایت نرمی اور بزرگانہ شفقت برتتے تھے لیکن اگر سیاست کی بات چھڑ جاتی تو وہ سنجیدہ ہو جاتے۔

ابتدا میں قائد اعظم اور میرے والد صاحب کے بے حد گہرے تعلقات تھے۔

لیکن ایک ذرا سی بات پر غلط فہمی نے تعلقات میں کشیدگی پیدا کر دی۔ میرے والد صاحب
حیدرآباد (دکن) میں وزیر اعظم (مدارالمہام) تھے۔ انگریزوں کی حکومت تھی۔ قائد اعظم
نے مسلم لیگ کے لیے چندے کی اپیل کی۔ وہ چاہتے تھے کہ نظام حیدرآباد اور میرے والد
بھی اس فنڈ میں چندہ دیں۔ لیکن میرے والد سر اکبر حیدری یہ نہیں چاہتے تھے کہ نظام
حیدرآباد یا وہ خود اس مد میں علی الاعلان شرکت کریں۔ اور اس کی اطلاع انگریز حکومت
کو ہو۔ چنانچہ میرے والد نے میرے بھائی کے ذریعے ایک معقول رقم سر سکندر حیات کو بھجوائی
کہ یہ روپیہ قائد اعظم کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ بات قائد اعظم کو سخت بری لگی۔ وہ
دنگ رہ گئے۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ نظام پر انگریزوں کا اس قدر دباؤ ہو سکتا
ہے اور انگریز انہیں اس طرح زیر کیے ہوئے تھے۔ چنانچہ اتنی سی بات پر قائد اعظم سر
اکبر حیدری سے خفا ہو گئے۔ پھر ایک مرتبہ میرے والد بمبئی آئے تو میں انھیں قائد کے گھر
لے گئی اور میں نے کوشش کی کہ قائد اعظم اور اپنے والد کے بیچ شکوک دور کر دئیے۔

قیام پاکستان سے پہلے ہی میرے شوہر کراچی آ گئے تھے۔ اس زمانے میں ایک مرتبہ
قائد اعظم کراچی آئے تو انہوں نے ہمیں شرف میزبانی بخشا۔ آتے ہی فرمایا کہ میرے لیے
کوئی تقریب یا دعوت نہیں ہوگی، صرف گھر کے لوگ ہی کھانے پر ہوں۔ ان کے حکم کی
تعمیل کی گئی۔ جب تک وہ ہمارے ہاں کراچی میں مقیم رہے ان کا یہ معمول تھا کہ صبح کے
وقت سیاسی لیڈروں سے ملاقات کرتے۔ لیکن ڈرائنگ روم کے سامنے دروازے بند
رہتے تھے۔ کوئی آ جا نہیں سکتا تھا۔ ان ملاقاتوں کا سلسلہ ظہر تک چلتا تھا۔ پھر وہ ہم
لوگوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاتے۔ اور آرام کرنے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔

کراچی آنے سے کچھ دن قبل ان پر بمبئی میں قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے ان
کی صحت اچھی نہیں تھی۔ وہ تھک جایا کرتے۔ لیکن اس کمزوری کے باوجود وہ ہر آنے جانے
والے سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ ان کے قیام کے دوران ایک سیاسی جماعت
کا جھگڑا ہو رہا تھا۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ اور جی ایم سید کا آپس میں جھگڑا ہو گیا۔ قائد
کی خواہش تھی کہ یہ جھگڑا رفع دفع ہو جائے اور دونوں مل کر مسلم لیگ کی خدمت کریں۔ چنانچہ

سے شوہر نے درمیان میں پڑ کر یہ جھگڑا طے کرایا۔

خواتین اور تحریک آزادی: قائد اعظم خواتین کی بہت عزت کرتے اور کہتے کہ جب تک عورتیں سیاست میں عملی حصہ نہیں لیں گی اور سوسائٹی میں اپنا صحیح کردار ادا نہیں کریں گی اس وقت تک مسلمانوں کو آزادی نہیں مل سکتی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر گھر کی بیگم مسلم لیگ کی ہم خیال ہو جائے تو اس گھر کے تمام لوگ، بیٹے، بیٹیاں، جوان اور بوڑھے سب کے سب مسلم لیگی ہو جائیں گے۔ وہ خواتین سے توقع رکھتے تھے کہ وہ ہر شعبۂ زندگی میں مردوں کا بھرپور ساتھ دیں۔

قیام پاکستان کے بعد ایک مرتبہ خواتین نے کراچی میں قائد اعظمؒ کا ایک استقبالیہ دیا۔ قائد اعظمؒ نے سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: "اب وہ وقت نہیں کہ خواتین پردے میں بیٹھیں! گھر کی دیکھ بھال اور گھرداری ان کا فرض اولین ضرور ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں عالمی واقعات سے بھی پوری طرح باخبر رہنا چاہیے۔ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ اور ہمیں ترقی کی راہ پر چلنے کے لیے کیا کچھ کرنا چاہیے؟ اس بارے میں خواتین کو شعور ہونا چاہیے۔" انہوں نے عورتوں پر زور دیا کہ وہ سیاست کے ساتھ ساتھ دفاعی ٹریننگ کی بھی پریکٹس کریں۔ رائفل چلانا سیکھیں تاکہ بوقت ضرورت اپنی حفاظت کر سکیں۔

خواتین کے بارے میں وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ تعلیم میں لڑکیوں کو کسی صورت بھی لڑکوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔ انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ تاکہ خود کفالت کے باعث ان میں آزادی رائے پیدا ہو سکے۔ اور کل کو کوئی ضرورت پیش آئے تو وہ بڑے سے بڑا فیصلہ کرنے کے قابل بن سکیں۔

نوجوان اور طالب علم: نوجوان اور طلبہ و طالبات سے انہیں بے حد محبت تھی۔ لڑکے ہوں یا لڑکیاں جب کبھی کوئی قائد اعظمؒ سے ملنے آتے تو وہ خوشی خوشی ان سے ملتے اور نہایت مشفقانہ انداز میں ان کے ہر سوال کا جواب دیتے اور انہیں سیاست کے بارے میں بہت کچھ بتلاتے۔ وہ ان سے باتیں کرتے ہوئے الجھتے نہیں تھے۔ اور پاکستان کے بارے میں ہر سوال کا جواب نہایت واضح انداز میں دیتے۔ جب کبھی طلبہ ان کا

موقف صحیح طور پر نہیں سمجھ لیتے تھے، قائداعظمؒ ان سے باتیں کرتے رہتے!

قائداعظمؒ طلباء کے ذاتی مسائل میں بھی بے حد دلچسپی لیتے تھے۔ وہ ان کی تعلیمی صورت اور مسائل کے بارے میں بھی سوالات کرتے۔ اور نہایت ہمدردی سے ان کی باتیں سنتے تھے۔ یہاں تک پوچھتے تھے کہ ان کے والدین کیا کرتے ہیں، کس ماحول میں رہتے ہیں اور ان کے مالی حالات کیسے ہیں؟ وہ فرداً فرداً ہر طالب علم سے ان کی تکالیف اور مسائل دریافت کرتے۔ یہ ان کی عام عادت تھی۔ پھر وہ کوشش کرتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح ان مشکلات کو دور کر دیں۔

میں بتا چکی ہوں کہ محترمہ کے سسرال سے قائداعظمؒ کے بہت دوستانہ مراسم تھے چنانچہ جب رتی پیٹیٹ سے ان کی شادی ہوئی تو ہم بھی اس میں شریک ہو سکے۔ ان کے سسرال والے پارسی تھے۔ مسٹر اور مسز ڈینشا پیٹیٹ بمبئی کا مشہور گھرانہ، امیر کبیر اور بڑے لوگ تھے۔

قائداعظمؒ اپنی بیوی کو بہت چاہتے تھے، وہ تھیں بھی اس قابل! بہت خوبصورت، مہذب، تعلیم یافتہ، باوقار اور بہترین مقرر! لوگوں کا یہ کہنا بجا ہے کہ قائداعظمؒ کے لیے ان سے زیادہ موزوں اور کوئی لڑکی نہیں تھی۔ ایک بار بمبئی ٹاؤن ہال میں لارڈ ولنگڈن کی الوداعیہ کا کچھ لوگوں نے انتظام کیا تھا۔ اس میں بہت ہنگامہ ہوا۔ اس الوداعیہ کی مخالفت بہت شور، وکلاء اور قومی لیڈر کر رہے تھے جن میں مسٹر جناح پیش پیش تھے۔ دونوں طرف سے جذبات میں ہلچل تھی۔ اس موقع پر مسز رتی جناح نے ٹاؤن ہال کی سیڑھیوں پر چڑھ کر ایسی دھواں دار تقریر کی کہ سارا مجمع قابو میں آ گیا اور جناح صاحب کے حریفوں کو سخت شکست ہوئی۔ مسز جناح قائداعظمؒ کی صد درجہ ہم خیال تھیں اور وہی کرتی تھیں جو ان کے شوہر چاہتے تھے۔

بیوی کی موت کے بعد قائداعظمؒ کے مزاج میں چڑچڑاپن آ گیا تھا۔ وہ مجبور رہ گئے تھے۔ وہ ضابطے کے بڑے پابند تھے۔ انہیں اپنے جذبات پر حد سے زیادہ قابو تھا چنانچہ لوگ یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ انہیں اپنی بیوی سے کتنی محبت تھی اور ان کے مرنے

کا انہیں کتنا غم ہوا۔ مگر جو لوگ قائداعظمؒ سے اچھی طرح واقف تھے وہ یہ محسوس کرتے
تھے کہ رتی کی جدائی سے وہ بے حد اداس ہو گئے تھے اور خود کو تنہا محسوس کرتے تھے

قائداعظمؒ کے ہاں نرینہ اولاد نہیں تھی۔ مسز رتی جناح سے ایک بچی پیدا
ہوئی جس کا نام دینا تھا۔ قائداعظمؒ اس بچی کو بے حد چاہتے تھے۔ دینا کو بھی اپنے باپ
سے والہانہ محبت تھی مگر کوئی شخص قائد کو برا کہہ دیتا تو وہ تڑپ اٹھتی۔ اسے فوراً غصہ
آ جاتا اور اتنی بحث کرتی کہ دوسرا آدمی لاجواب ہو کر رہ جاتا۔

قائداعظمؒ کے انتقال پر دینا کراچی آئی تو ہم لوگوں سے بھی ملنے آئی۔ قائداعظمؒ
کی موت سے وہ بے حد اداس تھی کہنے لگی کہ قائداعظمؒ نے لکھا تھا کہ تم دونوں بچوں
سمیت اکتوبر میں پاکستان آ جانا مگر وہ میرے آنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے

قائداعظمؒ کی بیگم جوانی ہی میں انتقال کر گئی تھیں۔ دینا اس وقت بچی تھی۔ چونکہ
قائداعظمؒ نے اپنی بیوی کے مرنے کے بعد دوسری شادی نہیں کی تھی۔ اور ان کے ہاں
دینا کی پرورش کے لیے کوئی خاتون نہیں تھی اس لیے اسے ننھیال بھیج دیا۔ قائداعظمؒ اسے
ملنے اور دیکھنے برابر اپنے سسرال جایا کرتے۔ چونکہ وہ لوگ پارسی تھے۔ اس لیے اس
کی تربیت آزاد فضا میں ہوئی۔ اسے ماں کا حسن و ذہانت اور باپ کا رعب اور
خودداری ورثے میں ملی تھی۔ وہ نہایت سخت طبیعت مگر دل کی بے حد اچھی تھی۔
جس سے ایک بار دوستی ہو گئی وہ کتنی ہی مدت بعد بھی بھولتی نہیں تھی۔ کراچی
میں ہم سے برسوں بعد ملی لیکن وہی محبت، وہی خلوص جو پہلے تھا یہی بات قائداعظمؒ
میں تھی۔ جس سے ملتے تھے خلوص سے ملتے تھے۔

قائداعظمؒ نہایت نفاست پسند تھے۔ ان کی ہر بات سے سلیقہ ٹپکتا تھا۔
وہ نہایت پُروقار انداز سے اٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے تھے۔ ملنے والے بھی
ایک شان اور وقار محسوس کرتے تھے۔ بمبئی میں ان کی کوٹھی تعمیر کے اعتبار سے قابل
تعریف ہی نہیں تھی بلکہ اس کو نہایت سلیقے اور محنت سے آراستہ بھی کیا گیا تھا۔
فرنیچر اور دوسرا ساز و سامان نہایت خوبصورت، قیمتی اور انگریزوں میں منتخب جانے

والا تھا۔ ان کی لائبریری دیکھنے کی چیز تھی۔ ہر موضوع پر نہایت اعلیٰ کتابیں ان کے کتب خانے میں موجود تھیں۔

قائداعظمؒ مچھلی بڑی رغبت سے کھاتے تھے۔ بٹیر اور فرنچ بھی اگر اچھی بنی ہوتی تو خوشی سے کھاتے تھے لیکن دسترخوان پر بہت زیادہ چیزوں کی موجودگی انھیں پسند نہ آتی۔ انھیں جو چیز پسند آتی اسے شوق سے کھاتے۔

مشروبات میں انھیں چائے پسند تھی۔ اور ہمارے ہاں جب بھی وہ مہمان ہوتے تو حکم یہ تھا کہ چائے ہر وقت ان کے کمرے میں تیار رہنی چاہیے۔ جب اپنے کمرے میں ہوتے تو اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پیتے تھے۔ ورنہ ہم لوگوں کے ساتھ اگر میز پر ہوتے تو ہم میں سے کوئی نہ کوئی ان کے لیے چائے بناتا۔ کام کرتے وقت ہمیشہ چائے ان کے سامنے ہوتی تھی۔

لباس کے بارے میں تو بڑے بڑے خوش لباسوں نے بھی یہ کہا کہ جس سلیقے سے قائداعظمؒ کپڑا پہنتے تھے، کسی کو اس طرح کپڑا پہنتے نہیں دیکھا۔ نہایت صاف شفاف اور بے شکن لباس پہنتے۔ اگر کبھی سوٹ کے بجائے کبھی شیروانی پہنتے تو اس کا انتخاب نہایت احتیاط اور سلیقے سے کرتے۔

بیگم سعیدہ قاضی

خوش ذوقی کے پیکر

میرے والد بھوپال میں تھے۔ ہم نے سنا کہ قائداعظمؒ کسی مقدمہ کے سلسلے میں یہاں آئے ہوئے ہیں اور شاہی مہمان کے طور پر نواب بھوپال کے مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کے اعزاز میں ایک دعوت دی گئی جس میں اپنے والد کے ساتھ میں نے بھی شرکت کی۔

اس وقت مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ قائداعظمؒ زیادہ گفتگو نہیں کر رہے تھے۔ مرد اور عورتیں الگ بیٹھے تھے اور کھانے کی میز پر ہم قائداعظمؒ کے ساتھ تھے۔ قائداعظمؒ جب بات کرتے تو سب لوگ خاموش ہو جاتے تھے۔ ان میں نواب بھوپال بھی شامل تھے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ کوئی سیاسی گفتگو نہیں کر رہے تھے بلکہ مقدمات کے بارے میں کچھ واقعات سنا رہے تھے۔ مس فاطمہ جناح بھی موجود تھیں۔ وہ ایک بہت خوبصورت ہار پہنے ہوئے تھیں۔ پوچھا تو کہنے لگیں "یہ میرے بھائی نے دیا ہے۔"

یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ میں قائداعظمؒ کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئی کہ جب اخبار میں مسلم لیگ کے بارے میں کچھ آتا تو ضرور پڑھتی۔ پھر ہم لوگ لاہور آ گئے۔ لاہور میں مسلم لیگ ضعیف ہی تھی۔ اور طالب علم خواہ وہ مسلمان

ہوں، ہندو یا سکھ، سب کے سب سیاست میں دلچسپی لے رہے تھے۔ میں
پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کر رہی تھی۔ عجیب زمانہ تھا۔ میرے خیال میں کوئی
طالب علم ایسا نہ تھا جس کو سیاست سے دلچسپی نہ ہو۔ ہم مسلمانوں نے
سوچا کہ یہاں مسلم گرلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کریں۔ یہ ۱۹۴۵ء کا ذکر ہے
قائداعظم لاہور آئے ہوئے تھے۔ اور ہماری پہلی میٹنگ تھی۔ ہم لوگوں نے
سوچا اگر قائداعظمؒ آ جائیں تو بڑا اچھا ہو۔ ہم ان کے پاس گئیں اور ان کے
سیکرٹری سے کہا کہ یہ ہماری پہلی میٹنگ ہے اگر قائداعظمؒ تھوڑی دیر خطاب کر
دیں تو ہم بہت شکر گزار ہوں گی۔ ہمیں یقین نہیں تھا کہ قائداعظمؒ ہمیں وقت
دے سکیں گے۔ اس لیے کہ اس زمانے میں لاہور میں سیاسی گہما گہمی بہت زیادہ
تھی۔ اور قائداعظم نہایت مصروف تھے۔ لیکن ایک روز کے بعد ان کے سیکرٹری
کا فون آیا کہ قائداعظمؒ آپ کے جلسے میں آئیں گے۔ چنانچہ مغرب کے وقت آپ
تشریف لائے اور انہوں نے پانچ منٹ ہم سے خطاب کیا۔ اپنی تمام مصروفیات
چھوڑ کر ہمارے لیے وقت نکالنے کا ہم لوگوں پر بہت اثر پڑا۔ ان کا رویہ بہت
مشفقانہ تھا۔

لڑکیوں کی تعلیم: آپ نے فرمایا کہ لڑکیوں کی تعلیم اتنی ہی ضروری ہے کہ
جتنی لڑکوں کی۔ گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ اگر ایک پہیہ خراب ہو تو گاڑی
نہیں چل سکتی۔ آپ کو زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ اور لڑکوں کے
دوش بدوش چلنا چاہیے۔ اگر خواتین تعلیم یافتہ ہوں گی تو اپنی آئندہ ذمہ داریاں
اچھی طرح پوری کر سکیں گی۔ اپنے گھر اور بچوں کی نگہداشت بہتر طریق پر کر سکیں
گی۔ آپ لوگ خود کو منظم کریں گھر گھر جا کر بتائیں کہ ووٹ کیسے دینا چاہیے لیکن
تعلیم سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔"

دہلی میں خواتین کا ایک جریدہ تھا "آن ورڈ" یہ سرکاری پرچہ تھا۔ میں اس
سے منسلک ہو گئی۔ قائداعظمؒ جب دہلی آتے تو میں ان سے جا کر ملتی تھی۔ وہ

بہت بارعب انسان تھے۔ شروع شروع میں ان سے بہت ڈر لگتا تھا مگر جب
بات کرتے تو نہایت شفقت اور نرمی سے۔ اور سننے والے کا جی چاہتا تھا
کہ وہ بولتے رہیں اور ہم ان کی باتیں سنتے رہیں۔

نئی دہلی میں قائد اعظمؒ کی کوٹھی اورنگ زیب روڈ پر تھی جسے بہت شائستگی
اور خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ بہت کم گھر ایسے ہوں گے جنہیں اتنی خوبصورتی
سے سجایا گیا ہو۔ وہاں ہر چیز سے سلیقہ اور نفاست ٹپکتی تھی۔ ان کے گھر کی آرائش
اور خوبصورتی دیکھ کر پتہ چلتا تھا۔ لگتی تھی کہ شاید اس میں مس جناح کا ہاتھ ہے۔
مگر ایک بار ہم وہاں پہنچے تو کوئی صاحب آئے۔ قائد اعظمؒ ان سے کہہ رہے
تھے کہ فلاں کرسی یہاں اچھی نہیں لگتی۔ وہ خود ہدایات دے رہے تھے۔ ایک بار ہم
لوگوں نے وہاں کھانا کھایا۔ پھر کافی آئی۔ ایک پیالی دوسری پیالیوں سے مختلف
تھی۔ قائد اعظمؒ کی نگاہ اس پر پڑ گئی تو مس جناح سے پوچھا "فاطمہ یہ پیالی
دوسرے سیٹ کی ہے" اس سے اندازہ ہوا کہ وہ ہر چیز پر نظر رکھتے تھے۔
ان کی خوش لباسی تو خیر مشہور تھی مگر ان کا باغ بھی بہت خوبصورت تھا۔

قائد اعظمؒ بہت کم کھاتے تھے اور بعض اوقات تو ان کو معلوم ہی نہیں
ہوتا تھا کہ وہ کیا کھا رہے ہیں۔ اگر کھانا کھا کر وہ اٹھ جاتے اور کوئی ان سے
پوچھتا کہ کیا کھایا تو وہ نہ بتا پاتے کیونکہ کھانے کی ان کو بالکل پہچان نہیں تھی
اگر کوئی بات چھڑ جاتی تو باتوں میں لگ جاتے اور کھانا پلیٹ میں رکھا رہ جاتا
تھا۔ بلکہ بعض اوقات ہم لوگ یہ سوچتے تھے کہ انہوں نے کچھ کھایا بھی ہے
یا نہیں۔

قائد اعظمؒ کا رویہ مہمانوں کے ساتھ بہت عمدہ ہوتا تھا۔ اب میں
سوچتی ہوں کہ کاش ہم لوگ بھی اسی طرح مہمان نواز ہوتے۔ ان میں بناوٹ
بالکل نہیں تھی۔ مجھے قائد اعظمؒ کے یہاں مہمان رہنے کا کئی بار موقع ملا۔ وہ
ہمیشہ خوش آمدید (You are welcome here.) کہا کرتے تھے

اور یہ بات محض زبانی ہی نہیں کہتے تھے بلکہ وہ مہمانوں کی اس وجہ خاطر مدارت کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ وہ ایک اچھے میزبان تھے۔ جس طرح اسلام ہمیں خوش خلقی کا سبق ملتا ہے۔ مجھے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ قائداعظم اس کا صحیح نمونہ ہیں۔ ایک دن میں نے پوچھا کہ "میں ایم اے کر رہی ہوں اس کے بعد مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

انہوں نے کہا کہ تعلیم تو لڑکیوں میں ضرور ہونا چاہیئے مگر ایم اے کے بعد اپنے والدین سے مشورہ کرو کہ کیا کرنا چاہیئے! میں نے کہا کہ وہ تو کہتے ہیں کہ اگر صحافت میں ایم اے کیا ہے تو کچھ دنوں کے لیے کسی میگزین یا کسی اخبار میں ملازمت کرو۔ تو کہنے لگے کہ تمہارے والدین جو کہتے ہیں میں بھی وہی کہتا ہوں۔ وہ چاہتے تھے کہ خواتین کو بھی اتنی ہی تعلیم حاصل کرنا چاہیئے جتنی مردوں کو۔ مگر اس کے باوجود وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہر عورت نوکری کرے۔ اگر ان کی یہ خواہش تھی کہ عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ چلیں تو وہ اس بات کی امید بھی رکھتے تھے کہ خواتین اپنے گھریلو امور اور سماجی بہبود کے کاموں میں بھی دلچسپی کا مظاہرہ کریں۔

قائداعظم سے جب بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں یہ خوبی تھی کہ وہ چھوٹے کے سامنے چھوٹے اور بڑے کے سامنے بڑے بن جایا کرتے تھے۔

بیگم شائستہ اکرام اللہ

عظمت کے روبرو

قائداعظمؒ سے پہلی ملاقات میرے ذہن میں آج تک محفوظ ہے۔ یہ ۱۹۴۰ء کی بات ہے کہ میرے والد صاحب قائداعظمؒ سے ملنے جا رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا: "تم بھی ساتھ چلو۔" میں نے کہا: "میں نہیں جاؤں گی کیونکہ سنا ہے کہ وہ بہت مغرور ہیں اور لوگوں سے نہیں ملتے۔" میرے والد صاحب نے کہا: "نہیں وہ ایسے نہیں ہیں۔ میں انھیں بہت دنوں سے جانتا ہوں۔ چلو میرے ساتھ چلو۔"

ہم ۱۰ بجے صبح قائداعظمؒ سے ملنے پہنچ گئے۔ وہ ناشتے کی میز پر تھے۔ قائداعظمؒ ہمیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ آگے بڑھ کر میرے ابا سے ہاتھ ملایا اور ہمیں ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ میرے والد سے گفتگو کرنے لگے۔ کبھی کبھی میں بھی اس گفتگو میں حصہ لیتی۔ مجھے تعجب اور خوشی اس بات پر ہوئی کہ قائداعظمؒ نے میری موجودگی کا برا نہیں منایا۔ گفتگو اتنی دلچسپ تھی کہ مجھے یہ خیال بھی نہ رہا کہ میں کس عظیم انسان کے سامنے موجود ہوں۔

"یوں میرا تعارف قائداعظمؒ سے ہوا۔ اس موقع پر محترمہ فاطمہ جناح بھی بہت محبت سے ملیں۔ اس کے بعد ان کے ہاں میرا آنا جانا ہونے لگا۔

بیگم صدیق علی خان

ساتھیوں کے ہمدرد

قائد اعظمؒ سے ملنے کا مجھے بہت کم موقع ملا لیکن ان کی قربت کا
شرف جس قدر میرے شوہر نواب صدیق علی خان کو حاصل رہا اور قائد اعظمؒ کے
خیالات و حالات کے مطالعہ کا انہیں جو موقع ملا میں اس سے بلاشبہ محروم رہی
تاہم قائد اعظمؒ کے متعلق جو کچھ میں نے سنا اور کبھی کبھی دیکھا وہ یہ ہے کہ وہ
ایک دور بین سیاست دان، صاحب شعور و کردار رہنما، اتحاد و اتفاق کے
مبلغ، عزم اور یقین محکم اور اولوالعزمی کی زندہ تصویر تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ایک
ہمدرد مسلمان، مشفق سرپرست اور مہربان رہبر بھی تھے۔ اگرچہ ضبط ان
کی فطرت تھی تو محبت و رعایت ان کی طبیعت تھی۔

مجھے یاد ہے کہ سی پی کی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی جانب سے آل انڈیا
مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی کانفرنس کا انعقاد ہونے والا تھا۔ اور قائد اعظمؒ سے
شرکت اور صدارت کی درخواست کی گئی تھی۔ چونکہ میرے شوہر اس کانفرنس
میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہے تھے اور شب و روز اس کی کامیابی کے لیے
بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ اس لیے سی پی کی انگریز گورنمنٹ نے ان کی ایک تقریر کو عذر
لنگ بنا کر انہیں جیل بھیج دیا۔ جہاں ان کے ساتھ عام مجرموں کی طرح کا سلوک روا

دکھا گیا۔

کانگریس وزارت کی کوشش یہ تھی کہ طلبا کی یہ کانفرنس ناکام ہو جائے اور قائد اعظم اس میں نہ آ سکیں۔ لیکن سی پی کے طلبا اور نواب صاحب کے ساتھیوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اور الحمد اللہ وہ کانفرنس کامیاب اور بہت کامیاب ہوئی۔ قائد اعظم تشریف لائے۔ محترمہ فاطمہ جناح بھی ہمراہ تھیں۔ چونکہ فطرتاً اپنے شوہر کی گرفتاری اور ان کے ساتھ عام قیدیوں جیسے سلوک نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ قائد اعظم کو سلام کر آؤں۔ چنانچہ میں وقت لے کر ان کے پاس گئی۔ محترمہ فاطمہ جناح نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور نہایت شفقت سے ملیں۔ بہت دیر تک میرے شوہر کے متعلق پوچھتی رہیں۔ میری خواہش پر قائد اعظمؒ کو میری آمد اور خواہش سے آگاہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد قائد اعظمؒ کمرے میں تشریف لائے۔ اگرچہ وہ بہت زیادہ مصروف تھے۔ میرے سلام کے بعد فرمایا کہ نواب صدیق علی خان کو کانگریس وزارت نے جیل بھیج دیا ہے لیکن گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ پہلے مسلم لیگی ہیں جو دو مرتبہ جیل گئے ہیں۔ اگرچہ مسلم لیگ نہیں چاہتی کہ اس کے کام کرنے والے جیل جائیں۔

<u>ساتھیوں کے لیے ہمدردی</u>: قائد اعظم کے ان جملوں سے مجھے بڑا اطمینان ہوا تاہم مجھے یقین نہیں تھا کہ اس سلسلے میں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی (جس کا اجلاس ناگپور ہی میں اسی روز ہونے والا تھا) کوئی کارروائی کرے۔ لیکن دوسرے روز صبح ہی ابراہیم خان آئے، جو نواب صاحب کے رفیق کار تھے، اگر مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ رات کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں قائد اعظمؒ نے بذات خود نواب صاحب کی رہائی کی تجویز پیش کی اور منظور کرائی۔ اس وقت یعنی رات کے تین بجے چیف سیکرٹری سی پی کانگریس گورنمنٹ کو تجویز بھجوا دی اور جب تک اس کا جواب نہیں آیا، قائد اعظم خود جاگتے اور ٹہلتے رہے۔ میرے دل میں جو جذبات تشکر اس وقت اپنے قائد کے لیے پیدا ہوئے ان کا اظہار قلم سے بالکل

ناممکن ہے۔

شاید ایک روز بعد ہی عید قربان آئی۔ اگرچہ مجھے اپنے شوہر کی باعزت رہائی کی امید پیدا ہو گئی تھی تاہم میں مغموم تھی۔ نواب صاحب کی طبیعت سے واقف تھی کہ جب انہوں نے اپنے مقدمہ کے لیے کسی وکیل کی خدمات حاصل نہیں کیں تو کون جانے کہ وہ رہائی پر بھی راضی ہوتے ہیں یا نہیں! مگر یہ تو باعزت طریقہ کی رہائی تھی۔ ان کے قائداعظم کی ورکنگ کمیٹی انہیں رہا کروا رہی تھی۔

بہرصورت میں نے نہ عید منائی اور نہ عورتوں کی عیدگاہ جانے کا ارادہ کیا جہاں قائداعظم اور خواتین کے لیے عید کی نماز کا انتظام کیا گیا تھا۔ مگر قائداعظم کا کمال دیکھیے کہ ان کو خیال تھا کہ شاید میں نماز کے لیے نہیں جاؤں گی اس لیے ایک شخص کو میرے پاس بھجوایا کہ میں تیار رہوں قائداعظم خود مجھے اپنے ساتھ عید کی نماز کے لیے لے جائیں گے۔ چنانچہ مجھے اپنے قائد کی خاطر تیار ہونا پڑا۔ ٹھیک ۹ بجے قائداعظم مرحوم غریب خانے پر مس جناح کی معیت میں تشریف لائے۔ اور مجھے عیدگاہ لے گئے۔ نماز کے بعد مس جناح مجھے بہت محبت سے سمجھاتی رہیں کہ قائداعظم شملے سے ہی گورنمنٹ کو نواب صاحب کی رہائی کے لیے کہہ چکے ہیں۔ ان شاء اللہ وہ جلد رہا ہو جائیں گے۔

اس ایک واقعہ سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ قائداعظم کو اپنے رفقاء اور ان کے اہل خاندان کا کتنا خیال تھا۔ اور ان میں دوسروں کے لیے ہمدردی اور دردمندی کا جذبہ کس قدر تھا۔

نورالصباح بیگم

خواتین کے محسن

قائداعظم خواتین سے بڑی اچھی گفتگو کرتے تھے۔ جو انگریزی بولتیں ان سے انگریزی میں ورنہ اردو میں! ایک بار بیگم حسین ملک، بیگم احمد شاہ بخاری اور میں "ہمارا فنڈ" کے لیے دس ہزار ایک سو روپے کا چیک لے کر ان کی کوٹھی پر حاضر ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ آپ مسلم لیگ کے اراکان سے محو گفتگو ہیں۔ ہمیں ان کے سیکرٹری مسٹر کے ایچ خورشید پر حیرت ہوئی کہ انہوں نے ہمیں بھی یہی وقت کیوں دے دیا۔ ہم نے سوچا کہ یہ ان کی بہت بڑی غلطی ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے خورشید صاحب نے ہم سے اندر چلنے کی استدعا کی۔

اندر قائداعظمؒ کے پاس سر سٹیفورڈ کرپس، سر پیتھک لارنس اور اے وی الیگزینڈر بیٹھے تھے۔ قائداعظمؒ کے ساتھ ہی یہ تینوں حضرات کھڑے ہو گئے۔ قائدؒ نے ان سے ہمارا تعارف کرایا۔ ہم نے ان کے قیمتی وقت کا اندازہ لگاتے ہوئے جلدی چیک پیش کر دیا۔ یہ چیک لیتے ہوئے قائداعظمؒ نے تعریفی نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور اپنے انگریز مہمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "دیکھا آپ نے میری قوم کی خواتین کا جذبہ! جس قوم کی عورتیں ایسی ہوں تو اس قوم کے مرد کیسے ہوں گے؟" اور ہم اجازت لے کر کمرے سے باہر نکل آئیں۔

بڑے بڑے مردانہ جلسوں میں قومی نظمیں پڑھتا ہے۔ انھوں نے فوراً ہی کہا "پرسوں صبح آپ اسے اپنے کو لے کر میرے گھر بھیج دیں میں بھی تو دیکھوں کہ وہ کیسا جوشیلا بچہ ہے۔"

تیسرے دن میرے شوہر تسنیم کو قائد اعظمؒ کی کوٹھی پر لے گئے۔ بچے نے چند تین قومی نظمیں پورے جوش و خروش سے محترمہ فاطمہ جناح اور قائد اعظمؒ کو سنائیں۔ آخری نظم تھی

ملت ہے فوج، فوج کا سردار ہے جناح

اسلامیانِ ہند کی تلوار ہے جناح

بچہ جوش و خروش سے جناح کے لفظ پر قائد اعظمؒ کی طرف اپنے ننھے ہاتھ سے اشارہ کرتا۔ آخر قائد اعظمؒ کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ انھوں نے بچے کو پاس بٹھا کر محبت سے پوچھا یہ نظمیں تم کس سے سیکھتے ہو۔ اس نے کہا امی سے! "تو میرے شوہر سے کہنے لگے" تمہاری بیوی بہت ہی قابلِ تعریف ہے۔ امید ہے کہ تم اس کے کاموں میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالو گے۔" محترمہ فاطمہ جناح نے بھی بچے کو پیار کیا۔ اور جب تک وہ حیات رہیں میرے اس بچے کے بارے میں ضرور معلوم کرتی رہیں۔

قائد اعظمؒ قوم کے لیے ایک شفیق اور نرم دل باپ کا سا درجہ رکھتے تھے ان سے مل کر ایسی کبھی نہیں ہوتی تھی بلکہ ان کے کمرے سے ہم خوش اور ہنستے ہوئے نکلتے تھے۔ ایک بار دہلی کناٹ سرکس میں میں اور میرا بچہ شام کو گھوم رہے تھے کہ دیکھا قائد اعظمؒ اور محترمہ فاطمہ جناح بھی ہم سے قدرے آگے چل رہے تھے۔ بیچ بازار بات کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے میں نے آہستہ خرامی اختیار کی۔ اور جب وہ ایک دکان کے اندر داخل ہو گئے تو میں بچوں سمیت جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دور جا کر پتہ چلا کہ میری شادی شدہ بڑی لڑکی غائب ہے۔ وہ ان دنوں رام پور سے آئی ہوئی تھی۔ میں واپس ہوئی اور بچوں سے کہا ذرا میں اس کو تلاش کر لوں تم یہیں کھڑے رہو۔

میں نے دیکھا کہ قائد اعظمؒ اور ان کی ہمشیرہ جوتوں کی ایک دکان میں کرسیوں

پہ شیشے جڑے پسند کر رہے تھے۔ اور میری بیٹی کو کب دروازے سے کھڑی قائداعظمؒ
کو دیکھے جا رہی تھی۔ وہ بڑی سیدھی سی لڑکی تھی۔ میں نے اس سے کہا "چلو۔"
تو وہ بولی "میں نے قائداعظمؒ کو قریب سے نہیں دیکھا تھا ذرا دل بھر کے انہیں
دیکھ لینے دیجئے!" اس کی عقیدت کو دیکھتے ہوئے میں دکان کے اندر داخل ہو گئی۔
مجھے دیکھ کر قائداعظمؒ کھڑے ہو گئے۔ میں نے پورا واقعہ بیان کرتے ہوئے اپنی بیٹی
کا ان سے تعارف کرایا۔ انہوں نے بڑی شفقت سے اسے دیکھا اور مجھ سے فرمایا
کہ کسی روز آپ ان کو میرے گھر لا سکتی ہیں۔

قائداعظمؒ کا طریقہ خواتین کے ساتھ بہت ہی کشادہ دلی کا تھا۔ لیکن عورت
ہو یا مرد وہ کبھی یہ برداشت نہ کر سکتے تھے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہوتے ہوئے
پارٹی سے غداری کرے۔ اور ایسے وقت میں خاتون کے لیے بھی وہی سزا تجویز ہوتی
جو کسی مرد کے لیے! تحریک پاکستان کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں ایسے واقعات
بھی ملتے ہیں، مگر خواتین جب مسلم لیگ میں شامل ہو جاتیں تو وہ مشکل سے ہی پارٹی
کے پروگرام کی خلاف ورزی کرتیں۔ ان کا عزم بہت مستقل ہوتا۔ پوری تاریخ میں
صرف پنجاب کی ایک خاتون رہنما انگریزوں کے بہکانے میں آ گئی تھیں مگر جلد ہی
ان کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس کے علاوہ ہمیں کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی
خاتون نے مسلم لیگ میں شامل ہونے کے بعد تحریک پاکستان سے علیحدگی اختیار کی
ہو یا جماعت کے احکامات کی خلاف ورزی کی ہو۔

آج کی عورت پر قائداعظمؒ کا عظیم احسان ہے کہ انہوں نے برصغیر کی مسلمان
عورت کو بھی سیاست میں حصہ لینے کی دعوت دی۔ اسی وجہ سے مسلمان عورتوں
کو اس میدان میں آزادی ملی۔ اس کے علاوہ ان رہنما خواتین نے جن کی قائداعظمؒ نے
بحیثیت لیڈر نامزد کی تھی، مسلمان لڑکیوں کی تعلیم پر شدت سے زور دیا۔ اور ہر صوبے
میں مسلم لیگی خواتین نے شہروں اور دیہات میں لڑکیوں کے بے شمار اسکول کھولے
جہاں ماؤں کی خوشامد کر کے لڑکیوں کو تعلیم کے لیے اسکول میں داخل کرایا گیا۔ آج

وہی لڑکیاں پاکستان کے اعلیٰ اداروں اور درسگاہوں میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ اور تعلیم کا گھر گھر رواج ہے۔ پاکستان کی یونیورسٹیوں میں لڑکیاں تعلیم کی مد میں لڑکوں سے بہت آگے نکل گئی ہیں۔ اور یہ سب پاکستانی عورت کے لیے قائدِ اعظمؒ کا فیض ہے۔

قائدِ اعظمؒ نے عورتوں کو جس مستقل مزاجی سے ملک و قوم کے لیے سیاسی شعور سے روشناس کرایا اس کی مثال نہیں ملتی۔ کیونکہ برصغیر کے مسلمان، عورت کے معاملے میں جو وہ رکھتے تھے ہی معقول ہوں یا رکھتے ہی عجیب، بے حد تنگ نظر اور فرسودہ خیالات تھے۔ گھروں کے اندر اخبارات کا آنا اور کتابوں کا موجود ہونا ممکن نہیں تھا۔ اول تو وہ پڑھی لکھی ہی نہ ہوتیں۔ اور اگر ذرا حرف شناس بھی ہوتیں تو یہ پابندی ان کو پتہ بھی نہ چلنے دیتی کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

ایسے میں قائدِ اعظمؒ کا وجود عورت کے لیے خضرِ راہ بن کر نمودار ہوا اور وہ باہر نکل کر مردوں کے دوش بدوش کام کرنے لگی۔ وہ بہت جلد ملکی سیاست کے ہر پہلو سے آگاہ ہو گئی۔ اور اب عورت کے لیے اس کے سامنے تحریکِ پاکستان میں جدوجہد کرنے کا ایک بڑا میدان موجود تھا جس میں ایک عزمِ مستقل کے ساتھ حصہ لے کر اس نے پاکستان حاصل کر لیا۔

قائد اعظم اور سیاسی رفقاء

میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو
ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبر اسلام نے بتایا ہے۔ ہمیں اپنی
جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر
استوار کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

(شاہی دربار سبی بلوچستان سے خطاب)
(فروری ۱۹۴۸ء)

چودھری خلیق الزماں

قائد اعظمؒ کی کامیابی کا راز

اگرچہ میری یادداشت کمزور ہو گئی ہے تاہم مجھے اتنا یاد ہے کہ سب سے پہلے مسٹر جناح سے میری ملاقات ۱۹۱۲ء میں ہوئی جب وہ مسلم لیگ کی صدارت کے لیے تشریف لائے اور لکھنؤ میں راجہ محمود آباد کے ہاں مہمان ہوئے تھے۔ میں اس وقت مہاراجہ صاحب کا پرسنل سیکرٹری تھا۔ اس کے بعد تو ان سے تعلقات بہت بڑھے۔ اور جب وہ مسلم لیگ میں آئے تو میں ان کے ساتھ کام کرتا رہا۔ یہاں تک کہ پاکستان کی جدوجہد میں میں نے ان کے ساتھ پورا تعاون کیا۔

قائد اعظمؒ عظیم شخصیت کے مالک تھے جب وہ کسی بھی مسئلے پر اپنی رائے قائم کر لیتے تو اس پر سختی سے عمل کرتے تھے۔ ان کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ وہ اپنے مقاصد میں بہت پختہ یقین رکھتے تھے۔

مرزا ابوالحسن اصفہانی

بے مثال لیڈر

قائد اعظم سے ملاقات کا اعزاز پہلی بار مجھے اس وقت نصیب ہوا جب میں کیمبرج میں زیر تعلیم تھا اور ہندوستانی طلباء کی مجلس سے خطاب کرنے آئے تھے۔ اس مجلس کا میں بھی رکن تھا۔ انہوں نے قوم پرستی اور سوراج پر اپنے موثر انداز میں تقریر کی اور ہم سب حاضرین جلسہ بہت متاثر ہوئے۔

قائد اعظم یوں تو ہر صفت سے موصوف تھے۔ مگر ان کی بصیرت اور دور بینی یقیناً بے مثل تھی۔ وہ کمال کے مردم شناس تھے اور ان کی انہی حیثیتوں سے متعلق ہوتی تھیں کہ ان کے لیے اپنے مخالفین کو اپنا ہم خیال بنا لینا ذرا مشکل نہ ہوتا تھا۔ ایسے بہت سے مواقع آئے جب انہوں نے اس باب میں لوگوں سے اپنی لیاقت کا لوہا منوا لیا۔ اسی قسم کا ایک واقعہ میری نظر سے گزرا ہے جسے میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ حکومت برطانیہ نے ہندوستان چھوڑ دو کی قرارداد منظور کرنے پر کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے تمام اراکین کو جیل میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت یہ عام رجحان تھا کہ ہر صوبے میں کانگریس کے ہمدرد بیٹھے کے لیڈروں نے مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے بعض اراکین سے چند ممتاز مسلم لیگی رہنماؤں اور ورکنگ کمیٹی کے ارکان سے ملاقاتیں کیں۔ ان میں سے اس بات پر اصرار کیا کہ مسلم لیگ اس موقعہ پر کانگریس کی حمایت کرے اور "ہندوستان چھوڑ دو" کی قرارداد منظور کرے تو

ہاتھوں میں مسلمانوں کے تمام مطالبات ماننے کے لیے تیار ہے تاکہ پاکستان کی اس تجویز
سے متاثر ہونے والوں میں میں بھی شامل تھا۔ مولانا اکرم خاں نے بھی اس دلیل کو قبول
کر لیا تھا۔ اور خواجہ ناظم الدین کا بھی جو بہت سنجیدہ آدمی سمجھے جاتے تھے۔ اسی طرف
جھکاؤ ہو گیا تھا۔

اس وقت بنگال کی صورت حال تو یہ تھی۔ رہے ہندوستان کے دوسرے
صوبے تو وہاں بھی مسلم لیگ کے متعدد رہنما کانگریس کی اس پیشکش کے حامی تھے مثلاً
یو پی سے جو ورکنگ کمیٹی کو سب سے زیادہ دانشور فراہم کرتا تھا) نواب اسمٰعیل خان،
چودھری خلیق الزماں اور راجہ محمود آباد جیسے لوگ صد فیصد اس تحریک کے حامی تھے۔
ان کا کہنا تھا کہ کانگریس کے ساتھ تعاون کر کے اپنا مقصد حاصل کرنے کا یہ بہترین موقع
ہے۔ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس شروع ہونے سے ایک روز پہلے شام کے وقت میں
اور راجہ صاحب محمود آباد حسبِ دستور قائد اعظم سے ملنے گئے۔ جمال میاں بھی ہمارے
ساتھ تھے۔ انہوں نے ہم سے پوچھا کہ آپ لوگوں کی رائے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔
ہم سب نے پرزور طریقے پر اس خیال کا اظہار کیا کہ کانگریس کی آواز پر لبیک کہنے
کا وقت آگیا ہے تاکہ برطانوی سامراج کو ملک سے نکالا جائے کیونکہ کانگریس نے
اس کے بدلے میں ہمارا پاکستان دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔

قائد اعظم ہمارے اس جواب سے قطعاً متاثر نہ ہوئے اور کسی قسم کی خوشی
کا اظہار نہ کیا۔ بلکہ انہوں نے کہا ”ہمیں جلدی میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔“ انہوں
نے فرمایا کہ ”میری طرف سے برطانیہ اور کانگریس دونوں ہی جہنم میں جائیں لیکن
ہمارے لیے بہتر یہ ہوگا کہ ہم اس معاملے میں دخل نہ دیں اور دور کھڑے ہو کر تماشا
دیکھیں۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی تو جیل میں چلی گئی سمجھیے۔ اس پارٹی کی تنظیمی صلاحیت
اور اپنے نظریات کو پھیلانے کی قوت کمزور پڑ جائے گی۔ اگر آپ ایک دو مہینے
انتظار کر لیں تو آپ اس بات کو خود محسوس کر لیں گے۔ جہاں تک برطانوی حکومت
کا تعلق ہے اگر اس مرحلے پر ہم نے اسے مدد کر دیا تو وہ ہمیشہ ساتھ ہی کانگریس

والا جیسا سلوک کریں گے۔ اور ہمیں بھی جیل میں ڈال دیں گے۔ کانگریس کے پاس لیڈروں کی کمی نہیں ہے۔ اگر اس کی ورکنگ کمیٹی کے پندرہ ممبر بھی جیل چلے جائیں تو ان کی جگہ کام سنبھالنے کے لیے دوسرے درجے کے سیکڑوں لیڈر موجود ہیں۔ لیکن ہم اگر جیل چلے جائیں تو مسلم لیگ اس وقت ایسے مرحلے میں ہے کہ وہ دم توڑ دے گی۔ ہمارے پاس متبادل لیڈر شپ نہیں ہے۔ ہمیں نہ حکومت سے ربط و ضبط بڑھانا چاہیے نہ کانگریس کے دام میں پھنسنا چاہیے۔ کانگریس کی قوت ٹوٹ رہی ہے۔ وہ غیر مؤثر ہو رہی ہے۔ اس وقت موقع ہے کہ ہم مسلم لیگ کی تنظیم پر زیادہ سے زیادہ توجہ دیں۔

ہم قائد اعظم کی رائے سے متفق نہ تھے۔ ہم لوگ تو پہلے ہی اپنی ایک رائے قائم کر چکے تھے۔ چنانچہ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس اگلے روز شروع ہوا تو خواجہ ناظم الدین ہمارے خیالات کی ترجمانی کے لیے کھڑے ہوئے۔ قائد اعظم نے بڑے اطمینان سے انھیں سنا اور خواجہ ناظم الدین اپنی تقریر ادھوری چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد چودھری خلیق الزماں کھڑے ہوئے اور اپنے موقف کے حق میں چند الفاظ سے زیادہ ادا نہ کر سکے۔

ہم یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوئے کہ ہمارے موقف کے سبھی حامی ہمیں چھوڑ گئے اور آخر میں ہم صرف تین رہ گئے جو اپنی بات پر ڈٹے رہے۔ راجہ صاحب محمود آباد، جی ایم سید اور میں۔ قائد اعظم نے ہمیں اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی لیکن ہم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ تاہم راجہ صاحب محمود آباد اور میں نے انھیں یہ یقین دلایا کہ ہم اس سلسلے میں مسلم لیگ کی قرارداد کی مخالفت نہیں کریں گے مگر ہم اس کی تائید میں بھی حصہ نہیں لیں گے لیکن سید نے صاف انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ میں تو ووٹ قرارداد کے خلاف دوں گا۔ انھیں منانے کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی چنانچہ ان کا ووٹ مخالفت میں ریکارڈ کیا گیا۔ قائد اعظم کے بارے میں میری کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہونے کے بعد سید نے مجھے بتایا کہ قرارداد پر ووٹ کے بعد بعض لیڈر

ان سے ملے تھے اور درخواست کی تھی کہ اس قرارداد کو کسی مخالفت کے بغیر ہی منظور کر
دیا جائے۔ بالآخر انھیں آمادہ کر لیا گیا اور بیگ ایم حسین نے قائد اعظم سے مل کر انھیں اس
فیصلے سے آگاہ کیا کہ اب میں مسلم لیگ کی رائے میں شامل نہیں ہوں گا۔ میں اپنا استعفیٰ اور
مخالف ووٹ واپس لیتا ہوں۔ میں نے اپنی کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں یہ نوٹ
درج کر لیا ہے۔ غرض قائد اعظم نے اس وقت درپیش حالات کو اس خوب صورتی
اور چابک دستی سے سنوارا کہ مسلمانوں کی آنے والی نسلیں ہمیشہ ان کی ممنون رہیں
گی۔ اگر ہم اس وقت کانگریس کے جال میں پھنس جاتے تو مسلم لیگ ختم ہو جاتی اور علامہ
صاحب محمد آباد قرارداد منظور ہو جانے کے بعد ہی یہ سمجھتے اور کہتے رہے کہ ہم
نے کانگریس کی حمایت نہ کرکے غلطی کی ہے۔ جس طرح ہیں نیل ورن کیا کرتی تھیں کہ
قائد اعظم کی رو سے آپ لوگوں سے نہیں ملتے، اور ان سے مل لو۔ وہ آپ لوگوں
سے تبادلہ خیال کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ ہچکچاہٹ اور تامل کے ساتھ ہم چلے جایا کرتے
وہ ہمیں اپنا ہم خیال بنانے کی بھی کوشش کرتے لیکن ہم ان کی رائے سے متفق
نہ ہوتے۔

پھر ایک اتوار کو جبکہ ہم کلکتے سے واپس دہلی جانے والے تھے، ہم اپنے علیم
بھائی کو خدا حافظ کہنے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حالانکہ ہم ابھی تک
اس معاملے میں ان کے ہم خیال نہ تھے۔ انھوں نے بڑی شفقت سے ہمیں بیٹھنے
کو کہا۔ وہ ناشتے کے بعد سگریٹ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ پھر انھوں نے
ہم سے پوچھا "کیا تم لوگ بمبئی کرانیکل اور سٹیٹسمین کا مطالعہ کرتے ہو؟ کیا ان اخباروں
کا نام سنا ہے؟"

ہم نے کہا: "جی ہاں۔ ہم یہ اخبارات پڑھتے ہیں۔" لیکن پھر ہم نے جرأت کر
کے قائد اعظم سے دریافت کیا کہ اس سوال سے ان کا مطلب کیا تھا؟ انھوں نے
فرمایا "بمبئی کرانیکل میں پنڈت نہرو کا جیل جانے سے پہلے بیان چھپا تھا جس میں
انھوں نے کہا تھا کہ مسلمان ایک اقلیت ہیں۔ ہم ان کے ساتھ بھی فراخدلانہ سلوک

ایسا ہے جو ایک قومیت کے ساتھ ہونا چاہیے اور اس سے فائدہ پہنچے۔ انھوں نے یہ
بھی کہا تھا کہ ہندوستان ایک متحدہ کل ہے اور یہ ایک ہی رہے گا۔ اس بیان میں
اس طرح کی اور بھی بہت سی باتیں کہی گئی تھیں۔ گاندھی نے گرفتار ہونے سے پہلے
اپنے آخری مضمون میں جو ہریجن میں شائع ہوا تھا، مسلمانوں کے ساتھ ظاہرا اپنی تمام
محبت اور تعلق خاطر کے باوجود اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ہم نے یہ دونوں
بیان پڑھے ہیں تو قائد اعظم نے ہم سے پوچھا کہ ان دونوں سے بڑا کوئی اور لیڈر بھی
ہے جو ہندو کانگریس کی ترجمانی کر سکے۔ ہمارا جواب انکار ہی میں تھا۔ اس پر قائد اعظم نے
کہا کہ نہرو اور گاندھی نے یہ باتیں جیل سے چند ہی روز پہلے کہی تھیں۔ آپ ان باتوں
پر کیسے یقین نہیں کرتے؟ آپ دوسرے اور تیسرے درجے کے لیڈروں کی باتوں میں آ
گئے۔ اس دلیل سے انہوں نے ہماری ساری مزاحمت کو چکنا چور کر دیا۔ شرم سے
ہماری گردنیں جھک گئیں۔ اپنے جوش میں تو ہم یہ بھی بھول گئے کہ ہم آپ کی فراست کے
قائل ہو گئے۔ ساری بات ہماری سمجھ میں آ گئی۔

قائد اعظم جب کلکتے روانہ ہو گئے تو شہید سہروردی نے کلکتہ میں مجھے ٹیلی فون کیا۔ وہ
بہت برہم تھے۔ وہ ورکنگ کمیٹی کے رکن نہیں تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم
نے یہ قرارداد کیوں منظور کرائی جبکہ ہم اس کے برعکس فیصلہ کر چکے تھے۔ اور اس کی ترجمانی
کے لیے تمہیں وہاں بھیجا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ خفا نہ ہوں۔ آپ
گرینڈ ہوٹل میں آئیں اور میرے ساتھ کھانا کھائیں۔ یہاں آرام سے باتیں ہوں
گی۔ سہروردی تشریف لائے۔ میں نے انہیں ساری کہانی سنائی۔ تفصیل سن کر وہ بولے کہ خدا
کا شکر ہے قائد اعظم نے بالکل صحیح فیصلہ کیا ہے اور اب میں پورے بنگال کا دورہ کر کے
عوام کو بتاؤں گا کہ تم نے یہ فیصلہ کیوں کیا۔ اگر اس وقت یہ فیصلہ نہ ہوتا تو پاکستان
نہ بنتا۔

احساسِ ذمہ داری

قائد اعظم کے احساس ذمہ داری کے متعدد واقعات میرے ذہن پر ثبت ہیں۔

وقت وہ بجلی کے سارے سوئچ آف کر دیا کرتے تھے۔ اپنے گھر میں ہوں یا میرے یہاں ہوں یا کسی میزبان کے گھر میں ہر جگہ ان کا یہی معمول تھا اور جب میں ان سے پوچھتا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو وہ کہا کرتے کہ ہمیں ایک واٹ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ میں ان سے آخری بار ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء کو گورنر جنرل ہاؤس میں ملا تھا۔ ہم کمرے سے نکلے تو وہ مجھے پورچ تک چھوڑنے آئے اور کمرے سے نکلتے وقت انہوں نے حسب عادت خود ہی تمام سوئچ آف کر دیے۔ میں نے ان سے کہا کہ جناب اب آپ گورنر جنرل ہیں اور یہ سرکاری قیام گاہ ہے۔ اس میں روشنیاں جلتی رہنا چاہئیں۔ قائداعظم نے جواب دیا کہ "یہ سرکاری قیام گاہ ہے اسی لئے تو میں اور بھی محتاط ہوں۔ یہ میرا یا تمہارا پیسہ نہیں ہے۔ یہ سرکاری خزانے کا پیسہ ہے اور میں اس پیسے کا امین ہوں۔ اپنے گھر میں تو مجھے اس بات کا پورا اختیار تھا کہ اپنی بتیاں ساری رات جلا رکھوں لیکن یہاں میری حیثیت مختلف ہے۔ تم نیچے اتر جاؤ تو میں یہ سوئچ بھی آف کر دوں گا۔"

قائداعظم کی خوش پوشی

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت ہی خوش لباس آدمی تھے۔ میں نے انہیں ۱۹۲۰ء میں دیکھا تو اس وقت بھی وہ بہت عمدہ لباس پہنتے تھے۔ میں ان کی اس خوبی سے بھی بہت متاثر ہوا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ یہ موری جو میں آج تک پہنتا چلا آرہا ہوں، یہ پتلون کی اسی کاٹ کی نقل ہے جو میں نے ۱۹۲۰ء میں قائداعظم کو پہنتے دیکھی تھی۔ میں اپنی اس پسند کو بدلنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ میں ڈھیلی اور لمبی موری نہیں بنواؤں گا۔ جو آج کل لوگ بنوا رہے ہیں۔ فیشن آتے جاتے رہیں گے لیکن میں اسی تنگ موری کی پتلون کو ترجیح دوں گا جو میں نے پہلی بار قائداعظم کو ۱۹۲۰ء میں پہنے دیکھی تھی۔

قائداعظم بہت عمدہ لباس پہنا کرتے تھے وہ اپنے لباس کے شوقین تھے

ان کے جوتے ہاتھ کے بنے ہوئے تھے جو پیرس سے منگائے جاتے تھے۔ ان کے تمام سوٹ
Saville Row Suit کے سلے ہوئے تھے۔ وہ بہترین قمیص پہنا کرتے
تھے اور سب سے جاذب نظر ٹائیاں لگایا کرتے تھے۔ غرض ہر اعتبار اور ہر معیار سے وہ انتہائی
خوش لباس آدمی تھے۔

یہ جنوری ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ میں یورپ سے تازہ تازہ لوٹا تھا۔ کچھ ہی
دنوں کے بعد مجھے ہندوستان کے تجارتی وفد کے قائد کی حیثیت سے مشرق وسطیٰ جانا
تھا۔ قائد اعظم ان دنوں کراچی میں تھے۔ حسب معمول یورپ سے واپسی کے بعد میں
اس مرتبہ بھی ان سے ملنے گیا۔ میں ان کے لیے باہر سے ہوانا سگار، ٹائیاں اور
ڈو بو ٹائیاں لایا تھا۔ انھوں نے میرے اس حقیر سے تحفے کو نہایت فراخدلی اور
خوش دلی و محبت کے ساتھ قبول کیا۔ انھوں نے کہا کہ "میں یہ سگار ضرور پیوں گا۔" انھیں
ٹائیاں بھی پسند آئیں۔ یہ سلکا (Sulkas) کی ٹائیاں تھیں جو ان دنوں بہترین
ٹائیاں بنانے والے سمجھے جاتے تھے لیکن بو دیکھ کر ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ لمبی چوڑی
پٹیاں کیسی ہیں۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ یہ بو ٹائیاں (Bow Ties) ڈنر جیکٹ
پر پہنی جاتی ہیں۔ میں آپ کے لیے تازہ ترین فیشن کی لایا ہوں۔ اس پر قائد اعظم
نے مجھ سے کہا کہ "میں تمھارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے
ان سے کہا "جناب آپ جو کچھ بھی چاہتے ہیں بلا تکلف فرما دیجیے۔" اس پر قائد اعظم
نے بتایا کہ "مجھے بو ٹائی باندھنا نہیں آتی۔" میں نے کہا کہ اگر آپ کو بو ٹائی باندھنا نہیں آتی
تو پھر آپ اب تک کیا پہنتے رہے ہیں؟" انھوں نے کہا "میری بو میں ایک کلپ لگا ہوتا ہے
جو کالر کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ اس طرح میں ہمیشہ ریڈی میڈ ٹائیاں باندھتا رہا ہوں۔"
میں نے قائد اعظم سے کہا کہ "جناب اسمارٹ آدمی کبھی ریڈی میڈ بو نہیں پہنتے وہ اپنی
بو ٹائیاں خود باندھتے ہیں۔"
قائد اعظم بولے "مجھے بو باندھنا آتی ہی نہیں تو پھر کیا کروں۔" میں نے کہا
"اچھا میں آپ کو باندھ کر دکھاتا ہوں۔" میں نے ایک بو ٹائی لے کر آہستہ آہستہ

باندھا۔ قائداعظم ایک طالب علم کی طرح اسے غور سے دیکھتے رہے اور جب میں باندھ
چکا تو بولے "نہیں میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس پر میں نے انھیں دو تین مرتبہ باندھ
کر دکھائی۔ کئی بار دیکھ لینے کے بعد انھوں نے کہا کہ "میرا خیال ہے کہ میں سمجھ گیا ہوں۔"
میں نے ان سے کہا، "تو پھر باندھ کر دکھائیے۔" انھوں نے اپنی ٹائی اتاری اور
ایک بار کوشش کر کے باندھنا شروع کیا۔ پہلی بار بہت بھدی بندھی۔ دوسری بار
غنیمت تھی۔ تیسری بار اور بہتر ہو گئی۔ وقت تو لگا۔ مجھے اچھی طرح یاد
نہیں لیکن غالباً پانچ چھ مرتبہ باندھ کر قائداعظم ایک عمدہ بو ٹائی
باندھنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب میں نے ان سے کہا "جناب عالی! میری
خواہش ہے کہ آپ ڈنر جیکٹ پہنیں تو میں آپ کو شاندار ———— (
ہو میں دیکھوں، بجائے کہ ان پرانی ٹائیوں میں جو پہلے آپ پہنتے رہے ہیں۔" انھوں
نے کہا۔ "ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا۔"

دہلی میں قائداعظم کی اورنگ زیب روڈ کی قیام گاہ میں بہت ہی عمدہ
اور ماڈرن فرنیچر تھا لیکن ان کی بمبئی کی کوٹھی کا فرنیچر پرانا تھا۔ مگر تھا نہایت
بڑھیا اور اعلیٰ قسم کا۔ گھر میں رنگ و روغن بے حد دل کش اور خوب صورت
تھا۔ انھوں نے کبھی اس موضوع پر مجھ سے بات تو نہیں کی۔ لیکن انھیں
اچھا گھر پسند بھی تھا اور گھر بنانے اور سجانے کا سلیقہ بھی تھا۔ وہ شاندار
مکان میں رہنا پسند کرتے تھے۔ مجھے تو ہمیشہ یوں لگا۔ جیسے وکالت
چمکتے ہی انھوں نے سب سے پہلی توجہ اچھے گھر اور اعلیٰ رہن
سہن ہی پر دی تھی۔

انھیں شاید پہلے ہی یقین تھا کہ وکالت کے پیشے میں انھیں کامیابی
ہوگی۔ جبھی تو بمبئی پریزیڈنسی مجسٹریٹ کے عہدے سے مستعفی ہو کر
وکالت اختیار کی تھی۔

قائد اعظم کو قالینوں کا بے حد شوق تھا۔ اور اس سلسلے میں ان کی معلومات ، اور تجربہ بے حد وسیع تھا۔ ان کے پاس بہت اچھے قالین تھے اور یہ بھی صحیح ہے کہ ایرانی قالین انہیں بے حد پسند تھے۔ کہیں ایرانی قالین نظر آجاتا تو وہ خریدے بغیر نہ رہتے تھے۔

سے ہندوؤں کے ہاتھوں بری طرح نقصان اٹھا رہے تھے اور اب وقت آگیا ہے کہ وہ خوشحال اور باشعور
لوگوں کو ان کی مدد کے لئے آگے بڑھنا چاہیے۔ مسٹر جناح اس نتیجے پر پہنچے تھے اور اس پر مصر تھے کہ
مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر ایک پرچم کے نیچے متحد ہو جانا چاہیے تاکہ وہ اپنا مقصد حاصل کر سکیں
لیکن ان کا کہنا تھا کہ اس بے مثال جدوجہد کو قانونی حدود کے اندر ہی رہ کر جاری رکھنا چاہیے۔ انھوں نے
کہا کہ اب مسلم لیگ نوابوں کے محلات اور جاگیرداروں کے دیوانوں میں مقید نہیں رہے گی۔ لیگ کو اگر
زندہ رہنا ہے تو اسے کروڑوں مسلمانوں کے دلوں کی ترجمانی کرنا پڑے گی۔ جو صدیوں کے کچلے ہوئے
ہیں۔ ان غریب مسلمانوں کی اقتصادی، سماجی اور ثقافتی نجات دلانا مسلم لیگ کا مقصد ہونا چاہیے۔"
انھوں نے اپنی گفتگو اس بات پر ختم کی کہ اگر ہم لوگ اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں تو ہمیں لیگ کے
اس پیغام کو بنگال کے گوشے گوشے تک پھیلا دینا چاہیے اور جگہ جگہ مسلم لیگ کی شاخیں قائم کرنی چاہئیں۔
جب میں قائد کے پاس سے اٹھا تو نہ صرف یہ کہ ان کی شخصیت سے بے حد متاثر ہو چکا تھا
بلکہ انھوں نے مجھ میں کام کرنے کی ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ میں نے محسوس کیا جیسے ہندوستانی
مسلم سیاست کے افق پر روشنی کی ایک کرن پھوٹ چکی ہو اور مسلمانوں کو اس روشنی کی طرف لے جانے
والا ایک قابل اعتماد رہبر مل گیا ہو۔

نظم و ضبط کے پیکر

مسٹر جناح ہمیشہ اتحاد، یقین اور تنظیم پر زور دیتے رہے۔ وہ خود بھی نظم و ضبط کی مکمل پابندی
کرتے تھے۔ اس کی ایک مثال ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے۔ ہندوستان میں عام انتخابات ہونے والے تھے۔ مسٹر
جناح جنہیں ساری دنیا ہندوستانی مسلمانوں کے قائد اعظم کی حیثیت سے جانتی تھی بنگال اور آسام کے
دورے پر تھے۔ انھوں نے یہ سفر ریل کے ذریعے کلکتہ سے شروع کیا۔ اس ٹرین کو "پاکستان اسپیشل" کا نام
دیا گیا تھا۔ راستے میں چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر مسلم لیگ کے کارکن اور مسلم عوام کا بے پناہ ہجوم
تھا۔ جو زبردستی ٹرین کو روک لیتا تھا تاکہ انھیں اپنے محبوب قائد کی ایک جھلک دیکھنی نصیب
ہو جائے۔ یہ لوگ اس ٹرین کا گھنٹوں اور بعض اوقات کئی کئی دن تک ریلوے اسٹیشنوں پر انتظار
کرتے رہتے تھے۔ قائد اعظم کو یہ بات کچھ اچھی نہیں لگی کہ ٹرین کو ان مقامات پر روک لیا جائے

ابوالہاشم خاں

کھرے سیاست دان

قائداعظم سے میری پہلی ملاقات تو ۱۹۴۰ء میں ہوئی تھی لیکن میں اس سے بھی تقریباً [illegible] سال پہلے سے ان کی صورت آشنا تھا۔ یہ ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں وہ صرف مسٹر جناح تھے ایک کامیاب بیرسٹر اور ہندو مسلم اتحاد کے نہایت سرگرم حامی۔ کلکتہ میں کانگریس کا ایک اہم اجلاس ہو رہا تھا۔ مسٹر جناح اس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے اس اجلاس میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے بارے میں ایک چودہ نکاتی فارمولا پیش کیا تھا۔ اگر یہ فارمولا قبول کر لیا جاتا اور کانگریس تدبر سے کام لیتی تو شاید مسلمانوں کو علیحدہ وطن پاکستان کا خیال تک نہ آتا۔ مسٹر جناح نے نہایت اعتماد سے اپنے چودہ نکات اجلاس میں پیش کیے۔ ان کا انداز گفتگو نہایت دلنشیں، واضح اور مدلل تھا۔ امید تھی کہ کانگریس کے عمائدین ان کے ان اہم مطالبات پر ضرور توجہ دیں گے۔ اور اس کے بعد ہندو مسلم اتحاد کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہو جائیں گی۔ لیکن مسٹر گاندھی نے ایک ایک کر کے سارے مطالبات رد کر دیے۔ اور ہندو مسلم اتحاد کی یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ مسٹر جناح جیسے قوم پرست اور روشن خیال مسلمان کو کانگریس کے اس متعصبانہ رویے سے دکھ ہوا۔ اور شاید اسی دن انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ سیاست میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی راہیں اب جدا جدا ہیں۔

مسٹر جناح کی تقریر اور ان کے رکھ رکھاؤ سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ وہ ایک با اصول اور کھرے سیاستدان ہیں۔ اور جذبات انگیزی اور سستے بازاری طریقوں سے گریز کرتے

ہیں۔ وہ جس مسئلہ کو صحیح سمجھتے ہیں اسی پر دو ٹوک بات کرتے ہیں۔ وہ اپنے مقصد کے حصول کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان کے بعض حریف ان کی صاف گوئی اور اصول پرستی کو ضد اور ہٹ دھرمی کا نام دیتے تھے۔ حالانکہ یہ سراسر لغو اور بہتان تھا۔

۱۹۳۶ء میں میں بنگال اسمبلی کا ممبر منتخب ہو چکا تھا۔ اگلے سال قائد اعظم محمد علی جناح مسلم لیگ کی تنظیم نو کے لیے کلکتہ آئے۔ اور مسٹر حسن اصفہانی کے ہاں ٹھہرے۔ اصفہانی صاحب نے مجھے قائد اعظمؒ سے ملاقات کی دعوت دی۔ اور میں ان کے گھر پہنچ گیا۔ قائد اعظمؒ سے باتیں شروع ہوئیں تو انہوں نے مجھ سے کہا: "نوجوان، تم جانتے ہو ہم تمہیں کیوں حسین کہا جاتے ہو؟" میں نے فوراً جواب دیا: "میں کیا مجھ جیسے ہزاروں نوجوان آپ کے جھنڈے تلے آسکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ کی تنظیم میں کشش اور جاذبیت ہو۔ آپ خود جانتے ہیں کہ نوجوان ذہن کو صرف ان راہوں سے محبت ہوتی ہے جن میں دشواریاں ہوں، رومانیت ہو اور کوئی چونکا دینے والی بات ہو۔ آپ میری صاف گوئی کو معاف فرمائیں تو عرض کروں گا کہ یہ ساری ہمہ ہمی، ہلا گلہ انگیزی اور ہنگامہ خیزی کانگریس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ جیل کی سخت سلاخوں کے پیچھے زندگی میں جو دلکشی اور پراسراریت ہے وہ آپ کے ہاں کہاں ہیں؟" قائد اعظمؒ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے کہا: "ہم مسلم لیگ کی تنظیم نو ایسی ہی کرنا چاہتے ہیں کہ بنگال اور پنجاب کے تمام پرجوش نوجوانوں کو صرف میں مسلم لیگ کے پرچم تلے اپنی طرف کھینچ لیں۔"

قائد اعظمؒ سے تفصیلی تبادلہ خیال اور ان کی باتوں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ مسلم لیگ کے جسم میں پھر سے جان ڈالنے کے لیے بے تاب ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ مسلم لیگ جو برسوں سے مردہ اور بے حس ہو چکی ہے اسے تازہ خون دے کر از سر نو زندہ کیا جائے تاکہ یہ اپنی فعالیت اور قوت کے بل پر پھر سے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کی جائے گی۔

قائد اعظمؒ کی صاف گوئی اور بے لاگ گفتگو سے متاثر ہو کر میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے طے کر لیا کہ میں قائد اعظمؒ کے جھنڈے تلے ضرور آجاؤں گا۔ اور پھر اسی وقت میں نے مسلم لیگ میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح قائد اعظمؒ سے میری شناسائی اور قربت کا آغاز ہوا۔

۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد میں نے کلکتہ کی ایک اور ملاقات میں قائداعظمؒ سے سوالات کیا کہ آپ کے ذہن میں مملکت پاکستان کا تصور کیا ہے؟ قائداعظمؒ نے میرے اس اہم سوال کا صرف دو فقروں میں یہ جواب دیا "مملکت پاکستان کی شکل و صورت کا انحصار پاکستان کے مستقبل کے معماروں پر ہے۔" میں نے بات کی مزید وضاحت کرنے اور اپنا مافی الضمیر سمجھانے کے لیے فوراً ہی کہا کہ یہ سارا کام آپ ہی کو کرنا ہے تو آپ کے خیال میں مملکت پاکستان کا انتظامی اور دستوری ڈھانچہ کس طرح کا ہوگا، یا ہونا چاہیے؟ قائداعظمؒ نے میرا سوال غور سے سنا اور نہایت پُراعتماد اور باوقار انداز میں کہا "یہ مملکت یقیناً اسلامی ہوگی۔ میرا ایمان ہے کہ قرآن کریم میں ہمارے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات موجود ہے۔ جس میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ اور اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں۔"

قائداعظمؒ سے باتیں کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اسلامی معاشرے اور اسلامی مملکت کے بارے میں وہ صحیح فہم و ادراک رکھتے ہیں۔ اور پاکستان کی عمارت کی دستوری اساس وہ قرآن و سنت ہی کو بنانے کے آرزومند ہیں۔

اتفاق دیکھیے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء میں کلکتہ میں موجود تھا۔ گاندھی جی بھی ان دنوں آشرم میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں گاندھی جی سے ملنے چلا گیا۔ ملاقات کے وقت مجھے ۱۹۲۸ء کا کلکتہ والا کانگریس کا جلسہ یاد آ گیا اور پھر وہ منظر میری آنکھوں میں پھر گیا کہ قائداعظمؒ ہندو مسلم اتحاد کے لیے مسلمانوں کی طرف سے اپنے چودہ نکات پیش کر رہے ہیں اور گاندھی جی انہیں قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ ایک ایک کر کے وہ ساتھ کے ساتھ نکات رد کرتے جاتے ہیں۔ چنانچہ میرا جی چاہا کہ اس واقعہ کا گاندھی جی سے ذکر کروں اور ان کا ردعمل دیکھوں — میں نے سلام دعا کے بعد گاندھی جی سے کہا: "گاندھی جی! اگر مسٹر جناح پاکستان کے مقابلے میں اپنا چودہ نکاتی منصوبہ آپ کے سامنے پیش کر دیں تو اب آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟" گاندھی جی نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فوراً کہا "میں بلا پس و پیش اس پیشکش کو قبول کر لوں گا۔" میں گاندھی جی کی صورت دیکھتا رہ گیا اور یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی کہ ۱۹۲۸ء میں قائداعظمؒ کا یہ فارمولا مسترد کر کے انہوں نے خود ہی پاکستان کی داغ بیل ڈالی تھی۔

نواب صدیق علی خان

ہمہ گیر شخصیت کے چند پہلو

مجھے یہ علم ہے اس زمانے میں شرف ملاقات حاصل ہوا جب مسلم لیگ کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ قائد اعظمؒ ہندوستان کی سیاست سے بیزار ہو کر لندن میں فروکش تھے۔ ۱۹۳۴ء میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ آپ کی ہر دلعزیزی کے باعث آپ کی ہندوستان میں غیر حاضری کے باوجود آپ کو بلا مقابلہ اسمبلی کا رکن منتخب کر لیا گیا۔ اسمبلی میں شرکت کے لیے آپ ہندوستان تشریف لائے۔ صوبہ متوسط و برار کے مسلمانوں نے مجھے اپنا نمائندہ منتخب کر کے مرکزی اسمبلی میں بھیجا۔ میں آزاد لیڈر کی حیثیت سے کامیاب ہو گیا۔ لیکن صوبے کے دوسرے آزاد احباب نے مجھے مدد دینے سے قبل یہ وعدہ لیا تھا کہ کامیابی کے بعد قائد اعظمؒ کی پارٹی کا رکن بنوں گا۔ وہ حضرات قائد اعظمؒ کی سیاسی صلاحیت اور تدبر کے پہلے ہی سے معترف تھے۔

دہلی کے کونسل ہاؤس میں مجھے قائد اعظمؒ سے پہلی مرتبہ ملنے کا موقع ملا۔ قائد اعظمؒ ایک صوفے پر بیٹھے کسی صاحب سے ہمکلام تھے۔ میں اسمبلی کے مسلمان اراکین سے متعارف نہیں تھا۔ اس لیے ایک ہندو دوست کا سہارا لیا اور انہوں نے قائد اعظمؒ سے میرا تعارف کرایا۔ میں نے آپ کی انڈیپنڈنٹ پارٹی میں شرکت کی اجازت چاہی جو منظور ہوئی۔ میرے سامنے ایک خفیف سا سوال تھا۔ جس کے الفاظ میں پھر دہراؤں

کا استقلال، لہجے میں دریا کا سکون، انداز میں آسمانوں کی بلندی اور آواز میں خلوص اور سچائی کے پاکیزہ چشمے تھے۔ اس شخصیت سے میں مرعوب بھی تھا اور مطمئن بھی۔

قائد اعظمؒ کی انڈین نیشنل پارٹی میں اکثر اراکین آزاد نمائندے کی طرح احکامات کی پابندیوں سے آزاد تھے۔ لیکن ہم پانچ رکن یعنی مولانا شوکت علی مرحوم، عبدالمتین چودھری مرحوم، سید غلام بھیک نیرنگ مرحوم، حاجی عبدالستار سیٹھ اور میں ہمیشہ اپنے لیڈر کی تائید میں اسمبلی میں ووٹ دیتے تھے۔ اسی لیے کئی بار ہندوستان کے اخبارات نے ہم پانچوں کو طعنے بھی دیئے کہ یہ قائد اعظمؒ کی کورانہ تقلید کرتے ہیں۔

کانگریسی دور حکومت میں ایک افسوسناک واقعہ چاندور لسوا (سی پی) میں پیش آیا۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک ہندو نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی۔ جسے قتل کر دیا گیا۔ اس مقدمہ میں چھ بے گناہ مسلمانوں کو سزائے موت اور چوبیس کو حبس دوام کی سزا سنائی گئی۔

میں بحیثیت اعزازی سیکرٹری چاندور لسوا ریلیف کمیٹی قائد اعظمؒ سے جا کر ملا۔ میری پریشانی کو دیکھ کر فرمانے لگے "تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہیے اللہ پر بھروسہ رکھو۔" مقدمہ کی روداد بڑی توجہ سے سنتے رہے۔ پھر فرمایا "اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں ناگپور ہائیکورٹ میں اس مقدمہ کی خود پیروی کرتا لیکن موجودہ سیاسی حالات کی وجہ سے میں دہلی سے باہر نہیں جا سکتا۔"

میں نے کسی قابل وکیل کی خدمات کے لیے عرض کیا۔ آپ نے دیگر وکلاء پر مسٹر کے ایل سوم جی کو ترجیح دی اور وعدہ کیا کہ انہیں بذریعہ ٹیلیفون ہدایت کر دی جائے گی۔ اور جب میں نے یہ کہا کہ مسٹر سوم جی اپنی فیس میں رعایت کریں تو آپ نے چیں بہ جبیں ہو کر فرمایا۔ "مجھے یہ بات پسند نہیں۔ اگر واقعی تم ان سے کام لینا چاہتے ہو تو ان کو منہ مانگی فیس دو۔" مسٹر سوم جی علالت کے باوجود قائد اعظمؒ کے کہنے پر ناگپور جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ناگپور ہائیکورٹ میں انہوں نے اپنی قابلیت اور قانون فہمی کے ایسے جوہر دکھائے کہ جج صاحبان اور سامعین انگشت بدنداں رہ گئے۔ ملزموں کو

یقین تھا کہ اللہ کی مہربانی اور مسٹر سوم جی کی پُر زور وکالت سے تمام ملزم رہا ہو جائیں گے۔ چنانچہ چند خود غرض لیڈروں نے قبل از فیصلہ قائداعظمؒ کو مبارکباد کے پیغام بھیجے۔ قائداعظمؒ کھرے اور کھوٹے کو خوب جانتے تھے، خاموش ہو رہے۔ ملزمین کی باعزت رہائی پر میں نے قائداعظمؒ کو جو آب و ہوا تبدیل کرنے مردان تشریف لے گئے تھے، مبارکباد اور شکریہ کا تار دیا۔ آپ نے اس کا جو جواب دیا اس سے میری مزید ہمت افزائی ہوئی۔ "تمہاری انتھک اور پُرخلوص کوششوں سے بے گناہ لوگ رہا ہوئے۔ اس پر میری دلی مبارکباد قبول کرو۔"

<u>قائد کا حوصلہ و عزم</u> : میں ایک اور واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں جس سے قائداعظمؒ کی شجاعت اور اللہ پر ایمان کی پختگی واضح ہو جائے گی۔ ۱۹۴۵ء میں صوبہ سرحد میں کانگریسی حکومت برسرِ اقتدار تھی۔ اسی اثناء میں مسلم لیگ کی صوبائی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اور قائداعظمؒ کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ چونکہ قائداعظمؒ پہلی مرتبہ صوبہ سرحد جا رہے تھے۔ اس لیے جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ نوابزادہ لیاقت علی خان نے مجھے حکم دیا کہ قائداعظمؒ کے دورہ سے چند دن قبل میں بحیثیت سالار اعلیٰ مسلم لیگ نیشنل گارڈ جلسہ و جلوس کے انتظامات کی دیکھ بھال کے لیے پشاور جاؤں۔ وہاں میں نے باہمی کشمکش اپنی آنکھوں سے دیکھی جو کم ہونے کے بجائے بڑھتی جا رہی تھی۔ میری مصالحتی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ اس لیے بحیثیت سالار اعلیٰ میری ذمہ داریاں دو چند ہو گئیں۔ جلوس کی تمام تر ذمہ داری میری تھی۔ میں نے قائداعظمؒ کی تشریف آوری سے ایک روز پیشتر اسی راستے سے جلوس نکالا جہاں سے قائداعظمؒ کی سواری گزرنے والی تھی۔ راستے میں ایک کوچہ ایسا پڑتا تھا جہاں خطرے کے امکانات بہت زیادہ تھے دوسرے دن قائداعظمؒ کا نہایت شاندار جلوس نکالا گیا۔ وہ ایک کھلی موٹر کار میں تھے۔ مجھے ان کے ساتھ بیٹھنے کی عزت حاصل ہوئی۔ لوگوں کے بے پناہ شوق و جذبہ اور جوشِ عقیدت کی وجہ سے آپ نشست کے بلند حصے پر بیٹھ گئے۔ تاکہ ہر شخص

آپ کو آسانی سے دیکھ سکے۔ جب ہم اس پُرخطر مقام پر پہنچے تو میں نے عرض کیا
کہ یہ گلی تنگ ہے اور لوگ بھی یہاں کم ہوں گے۔ بہتر ہے کہ آپ پچھلی نشست پر
تشریف رکھیں۔ قائد اعظمؒ ماہرِ نفسیات تھے فوراً میرے مقصد کو تاڑ گئے۔ کار
رکوائی اور مجھے نیچے اترنے کا حکم دیا گیا۔ میں حیران تھا کہ یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے؟
میں نے بسر و چشم تعمیل ارشاد کی۔ قائد اعظمؒ دستور اپنی جگہ پر بیٹھے فرمانے لگے۔
”چار چار ڈی ایس پی موٹر سائیکلوں کی چار قطاریں کار کے آگے اور پیچھے مرتب کردو!“ اس
کام میں پندرہ منٹ صرف ہوگئے۔ اور وہ کار میں اسی طرح بیٹھے مسکراتے
رہے۔ پھر مجھے اشارے سے کار میں واپس بلایا۔ جب میں بیٹھ گیا تو شہادت کی
انگلی کو آسمان کی طرف اٹھا کر کہا: ”اللہ سب سے بڑا ہے!“ اس کے بعد میں کیا
کر سکتا تھا۔ میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

قائد اعظم اور حیدر آباد دکن عرصہ دراز سے قائد اعظمؒ کی منت سماجت کی
جارہی تھی کہ وہ حیدر آباد (دکن) جا کر سیاسی گتھی کو سلجھائیں اور امورِ سلطنت کو
بہتر بنانے سے متعلق مشورہ دیں۔ یہ ذہن نشین رہے کہ یہ وہ نازک زمانہ تھا جب
مجاہدِ ملت نواب بہادر یار جنگ جامِ شہادت نوش کر چکے تھے۔

سلاطینِ سلف سب ہو گئے نذرِ اجل عثمان
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

مملکتِ حیدر آباد اور اس کی مسلم آبادی کی تمام امیدیں اسی ایک ذات سے
وابستہ تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہستی کے اٹھ جانے کے بعد ابتری باعثِ تعجب نہ تھی
آل انڈیا مسلم لیگ کے دفتر دلی سے مجھے بمبئی میں اچانک اطلاع ملی کہ قائد اعظمؒ تنہا
حیدر آباد تشریف لے جا رہے ہیں۔ بحیثیت سالارِ اعلیٰ مجھے اپنے اکابرین کی تمام
نقل و حرکت سے ہمیشہ مطلع کیا جاتا تھا تاکہ میں حفاظت کا انتظام کر سکوں۔ قائد اعظمؒ
کی روانگی اور وہ بھی تن تنہا، تشویش انگیز تھی۔ لہٰذا سب نے فیصلہ کیا کہ میں ان کے
ہمراہ حیدر آباد جاؤں۔ بمبئی مسلم لیگ نیشنل گارڈز کا ایک دستہ سید شمس علی انعام دار

سالارِ صوبہ حبیبی کی سرکردگی میں عازم حیدرآباد ہوا۔

بالآخر وہ دن آیا جب قائدِ اعظمؒ ناگپور کے ہوائی مستقر پر پہنچے جو شہر سے بہت دور ہے۔ لیکن یہ فاصلہ عقیدت مندوں اور کارکنوں کو ان کے دیدار سے باز نہ رکھ سکا۔ ایک بڑا ہجوم زندہ باد کے نعرے لگاتا شوقِ دید میں وہاں موجود تھا۔ قائدِ اعظمؒ اپنے مخصوص انداز میں جہاز سے اتر آئے۔ جہاز کے پائلٹ آغا نواب مرحوم تھے۔ میں والہانہ آگے بڑھا۔ آغا کی نظریں مجھ پر پڑیں۔ وہ قائدِ اعظمؒ کے سچے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ انہیں اکثر قائدِ اعظمؒ کو اپنے ہوائی جہاز میں لے جانے کا شرف حاصل رہا تھا مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں قائدِ اعظمؒ کے ہمراہ حیدرآباد جا رہا ہوں تو کہنے لگے کہ تمہارے ہمسفر ہونے سے مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ مجھے جہاز کی فکر نہیں۔ بس اب ہند کی کشتی کے ناخدائی فکر دامن گیر ہے۔ یہ کہہ کر بے ساختہ انھوں نے کہا:

؎ سپردم بتو مایۂ خویش را

ہم سب ناشتہ کے لیے ریسٹورنٹ گئے۔ میں نے قائدِ اعظمؒ سے دریافت کیا: سفر کیسا رہا؟ فرمایا: "سفر نہایت خوشگوار تھا۔ کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔" آغا نواب مجھ سے کہنے لگے۔ دلی اور گوالیار کے درمیان فضا بہت ابر آلود اور تکلیف دہ تھی۔ لیکن اس خیال سے کہ قائدِ اعظمؒ کو کوئی تکلیف نہ ہو میں نے وہ راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کیا۔ قائدِ اعظمؒ یہ بات سن کر مسکرائے۔ لبوں کو جنبش ہوئی اور معنی خیز انداز میں فرمایا۔ "ٹھیک ہے۔"

میں نے عرض کیا کہ میں بھی اسی جہاز سے حیدرآباد جا رہا ہوں۔ تو جرح شروع ہو گئی۔ میں مختصراً جواب دینے لگا۔ آخر بات میرے یہ کہنے پر ختم ہوئی کہ آپ کو بھی حیدرآباد سے دعوت ملی ہے اور مجھے بھی، اور میں نے دعوت قبول کر لی ہے اس لیے حیدرآباد کا ارادہ ہے۔ قائدِ اعظمؒ کی گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ ان کی خاطر حیدرآباد جانے کی زحمت گوارا کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی حفاظتی انتظامات کی۔ بلکہ جب

انھیں میرے اس فیصلہ کا علم ہوا تو خاموش ہو گئے۔

لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہوا کہ مسافر ہوائی جہاز پر سوار ہو رہے ہیں۔ قائدِ اعظمؒ اٹھے اور کمرے کے باہر تشریف لے گئے۔ فضا نعرۂ تکبیر، قائدِ اعظم زندہ باد، پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ جہاز روانگی کے لیے تیار تھا۔ سب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ ہوائی جہاز روانہ ہونے والا تھا۔ مجھے قائدِ اعظمؒ کی برابر والی سیٹ ملی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بار بار پیچھے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد میں سمجھ گیا کہ کیا ماجرا ہے۔ میں نے بھی تمام مسافروں پر اچٹتی نگاہ ڈالی۔ مشتبہ حالت نے ایک جگہ میری نگاہیں روک لیں۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ احتیاطاً اس کی نگرانی کڑی کر دی۔ لیکن اصل بات آدھ گھنٹے بعد سمجھ سکا۔

قائدِ اعظمؒ اپنی نشست چھوڑ کر غسل خانے کی طرف تشریف لے گئے۔ میری گستاخ نگاہیں ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔ غسل خانے کا دروازہ کھلا تھا۔ میری نظریں اسی طرف جمی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے سامان کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں ساری بات سمجھ گیا۔ وہ واپس آئے اور آرام سے بیٹھ گئے اور حیدرآباد کے مستقر تک مجھ سے ہمکلام رہے۔ ہم کیبن کے قریب دیوار میں تھے۔ کھڑکی میری طرف تھی۔ میں نے باہر بے پناہ ہجوم دیکھا اور ان سے عرض کیا کہ بے شمار شیدائی استقبال کے لیے آئے ہیں۔ چہرے پر فکر کے آثار نمودار ہوئے۔ میں نے عرض کیا کہ اپنا سامان میرے سپرد کر دیجئے میں اسے بحفاظت مہمان خانے لے آؤں گا۔ خاموش ہو گئے۔ پھر فرمانے لگے کہ اس سامان میں میرے بہت اہم کاغذات ہیں۔ اس بات پر میں کچھ آزردہ ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ اگر آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے تو یہ سامان میرے سپرد نہ کیجئے۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ خاموش ہو گئے۔ پھر مجھے تھپک کر کہنے لگے "عدم اعتماد کی بات نہیں ہے۔ میں نے جو بات تم سے کہی ہے وہی بات میں اپنی بہن سے بھی کہتا ہوں۔" میرا دل باغ باغ ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہوائی جہاز مستقر پر رک گیا۔ ایک عظیم مجمع نظم و نسق کی بالائے

طاق رکھ کر اپنے رہنماؤں اور پولیس کی اپیل کو ٹھکرا کر ہوائی جہاز کی طرف ٹوٹ پڑا
دروازہ کھلنے سے قبل قائداعظمؒ نے اپنے سامان کی حفاظت کے لیے دوبارہ تاکید
کی۔ زائرین کے شوقِ دید کی حالت یہ تھی کہ سیڑھی لگتے ہی ہوائی جہاز میں گھسنے کی کوشش
کرنے لگے۔ لیکن ان کی کوششیں رائیگاں گئیں کیونکہ سیڑھی کو علیحدہ کر کے دروازہ بند کر
دیا گیا۔ وہ چند ساعتیں نہ صرف قائداعظمؒ کے لیے بلکہ تمام مسافروں کے لیے نہایت
تکلیف دہ تھیں۔ کسی کو غضب ترکیب سوجھی۔ پٹرول کی گاڑی جہاز کے دروازے پر
لائی گئی اور قائداعظمؒ اس پر سوار ہوئے۔ تھوڑا فاصلہ اسی طرح طے کیا گیا کہ پولیس
نے مجمع پر قابو پا لیا۔ اور قائداعظمؒ ریاست کی کار پر روانہ ہو گئے۔ آخر میں قائدؒ کے
سامان سمیت میرے اترنے کی باری تھی۔ باہر سالار صوبہ بلیکی میرے منتظر تھے
جنہوں نے مہمان خانے کی بند گاڑی میں سامان خود رکھا۔ میرے سالار نے انتہائی
کوشش کی کہ سامان ان کی تحویل میں چھوڑ دیا جائے۔ لیکن قائداعظمؒ کی تاکید اور
سامان کی موجودگی اور میرے احساسِ فرض نے مجھے یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ اگر میرے
والد صاحب مرحوم بھی اس خدمت کو اپنے ذمے لینے کے لیے تیار ہوتے تو نہایت
ادب سے میں مجبوری کا اظہار کر دیتا۔ میں نے بند گاڑی میں سامان کے ساتھ ساتھ
سترہ میل کا سفر طے کیا۔ جب میں راک لینڈ گیسٹ ہاؤس پہنچا تو قائداعظمؒ نواب
چھتاری سے ہمکلام تھے۔ میں نے ان کے کمرے میں سامان احتیاط سے رکھا اور
قریب جا کر عرض کیا کہ سامان ملاحظہ فرما لیں۔ فوراً اٹھے۔ اندر تشریف لائے۔
دائیں سے بائیں، ہر چیز پر انگلی رکھ کر سامان گنا اور پھر بائیں سے دائیں اس عمل کو
دہرایا۔ مسکرا کر میری طرف دیکھا اور شکریہ ادا کیا۔

دوسرے دن صبح میری طلبی ہوئی۔ دریافت کیا کہ تمہیں خبر ہے کہ میرے ان
سوٹ کیسوں میں کتنے قیمتی کاغذات ہیں؟ میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتا تھا کہ یقینی
طور پر بہت بیش بہا چیزیں ہوں گی جن کی اتنی حفاظت کی جا رہی ہے۔ وہ ایک
سوٹ کیس کے پاس تشریف لے گئے۔ ایک فائل نکالا اور چند اقتباسات ادھر ادھر

سے پڑھ کر سنائے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ مجوزہ کارروائی کے بارے میں میری رائے کیا ہے۔

قائداعظمؒ کے اس اظہارِ اعتماد کا مجھ پر نہایت ہی خوشگوار اثر پڑا۔ اس گفتگو کے بعد قائداعظمؒ نظام کے محل کنگ کوٹھی تشریف لے گئے۔ ملاقات مشکل سے دو منٹ جاری رہی۔ واپس تشریف لائے۔ میں بے چینی سے منتظر تھا۔ باوقار چہرے سے برہمی ظاہر ہو رہی تھی۔ سخت لہجے میں فرمایا: "کیا میرے بمبئی جانے کے لیے آج ہی ہوائی جہاز کے ٹکٹ کا بندوبست کر سکتے ہو؟ اگر آج انتظام نہ ہو سکے تو میں کل ضرور چلا جاؤں گا۔" میں بھانپ گیا، اور اس نازک وقت کو ٹالنے کی غرض سے یہ کہہ کر ان کے سامنے سے ٹل گیا کہ میں معلومات حاصل کرتا ہوں۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد حاضرِ خدمت تھا۔ اب چہرے پر خفگی کی جگہ بددلی کے آثار تھے۔ کہنے لگے: "ٹکٹ کا بندوبست ہو گیا؟" میں نے لجاجت سے عرض کی: "اگر آپ اس حالت میں حیدرآباد سے چلے گئے تو یہاں قتل و غارت کا بازار گرم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس آپ کی موجودگی سے مسلمانوں کے ٹوٹے ہوئے دلوں کی ڈھارس بندھی رہے گی۔ آپ کی رہنمائی میں وہ موجودہ مشکلات کا سامنا کر سکیں گے۔ اور ممکن ہے کہ باہمی اختلافات دور ہو جائیں۔" یہ بات ایک ساعت میں کہی گئی تھی۔ چنانچہ قبول ہوئی اور سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا گیا۔ تمام توجہ مختلف پارٹیوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے یعنی انجمن اتحاد المسلمین میں ضم کرنے پر مبذول کی گئی۔ اور اسی پر آئندہ کی کامیابی کا انحصار تھا۔ فرمانے لگے: "حیرت زدہ کیوں ہو؟" پھر کمال مہربانی سے فرمایا: "تمہیں سوچنے کا وقت دیتا ہوں جب میں جلسہ گاہ جانے لگوں اپنی رائے سے مطلع کر دینا۔"

شام کو اتحاد المسلمین نے جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ جلسہ میں آپ نے تقریر کی۔ آپ کی تقریر نے حیدرآباد والوں کے یقینِ محکم، اتحاد اور تنظیم کے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کر دیا۔ اور یہ اسی تقریر کا نتیجہ تھا کہ مختلف پارٹیاں متحد ہو گئیں۔ اور اتحاد المسلمین کے نامزدوں کو انتخابات میں شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔

پروفیسر اے بی اے حلیم

علی گڑھ سے محبت

قائداعظم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ میں ہوئی۔ اس سال ہم نے علی گڑھ کی سلور جوبلی منائی جس میں مسلم ہندوستان کے سب سے بڑے علی گڑھ تشریف لائے تھے انہی میں جناح صاحب بھی شامل تھے۔ مجھے یاد ہے کہ مسٹر جناح نے یونین کے جلسے سے خطاب فرمایا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ علی گڑھ آتے رہتے تھے۔ وہ بہترین مقرر تھے اور ہم لوگ بڑے شوق سے ان کی تقریریں سنتے تھے۔ لیکن انگلستان سے واپسی کے بعد ۱۹۳۵ء سے انہوں نے علی گڑھ کی طرف خاص توجہ دی۔

قائداعظم اصولوں کے سختی سے پابند تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ سنیے۔ قائداعظم علی گڑھ تشریف لائے۔ اسٹیشن پر ان کی پیشوائی کے لیے ہزاروں کا مجمع تھا۔ گاڑی رکی تو سب سے پہلے میں ان کے ڈبے تک پہنچا۔ میں اس زمانے میں یونیورسٹی کا پرو وائس چانسلر تھا۔ قائداعظم دروازے پر ہاتھ جوڑ کر لوگوں کے نعروں کا جواب دے رہے تھے۔ ساری فضا "قائداعظم زندہ باد"، "مسلم لیگ زندہ باد" کے نعروں سے گونج رہی تھی کہ ایک رئیس آدمی آگے آئے اور انہوں نے قائداعظم سے مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن قائداعظم نے انکار کر دیا۔ اس پر کسی نے قائداعظم سے عرض کیا کہ "جناب! یہ فلاں شخص ہیں، صاحب حیثیت آدمی ہیں، کسی شہر سے چل کے آئے ہیں۔ آپ ان سے مصافحہ کیوں نہیں کر لیتے؟" کہنے لگے "یہ سب کچھ درست! لیکن اگر میں ان سے ہاتھ ملاؤں تو مجھ

ڈاکٹر افضال حسین قادری

مقصدیت کا پیکر

میں نے قائد اعظم کو سب سے پہلے علی گڑھ یونیورسٹی کی سلور جوبلی کی تقریبات کے دوران دسمبر ۱۹۲۵ء میں دیکھا۔ یونیورسٹی یونین کے زیر اہتمام مباحثہ تھا۔ اور قائد اعظم اس میں بحیثیت جج شریک تھے۔ مباحثے کے دوران قائد اعظم مستقل اپنی جگہ بدلتے رہے۔ کبھی آگے بیٹھ جاتے اور کبھی سب سے پیچھے اور کبھی دائیں بائیں۔ جب وہ پیچھے آئے تو میرے پاس آ بیٹھے۔ یہاں میں نے ان کو قریب سے دیکھا۔ میں اس وقت دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ بعد ازاں جب میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گیا تو وہاں چوہدری رحمت علی کی وجہ سے مسلمان طلبا میں پاکستان کا مطالبہ زور پکڑنے لگا تھا۔ میں نے اس زمانے میں قائد اعظم کو خطوط بھی لکھے۔ میں اس وقت کیمبرج میں زیر تعلیم تھا۔

انگلستان سے واپس پہنچ کر میں نے قائد اعظم کو پٹنہ کے اجلاس میں دیکھا۔ اس زمانے میں ان کی صحت اچھی نہ تھی۔ ان کی پسلی میں درد رہتا تھا مگر اب وہ سارے ہندوستان میں مسلمانوں کے سب سے بڑے لیڈر مانے جا چکے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں میں نے انہیں خط لکھا جس میں ان سے پاکستان کا تصور مان لینے کی درخواست کی۔ اسی زمانے میں تقسیم ہند کے بارے میں میری اور ڈاکٹر ظفر الحسن کی تجویز شائع ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب میرے استاد بھی تھے اور رفیق کار بھی۔ قائد اعظم نے ہمیں ملاقات کی دعوت دی۔ ہماری یہ

ملاقات دہلی میں ان کی قیام گاہ پر ہوئی۔ انہوں نے ہماری تجاویز کو نہایت ہمدردی اور غور سے سنا۔ اور تجویز کے مختلف پہلوؤں، اعداد و شمار اور جزئیات پر باتیں کیں۔ پھر انہوں نے کہا کہ تم میری ورکنگ کمیٹی کو سمجھاؤ۔ اس کے بعد ہماری ملاقات ہوئی۔ پوری ورکنگ کمیٹی موجود تھی۔ بنگال سے مولوی فضل الحق صاحب بھی آئے تھے۔ پنجاب سے سر سکندر حیات خاں، اپنی علیحدہ تجویز لائے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ پنجاب کو تقسیم نہیں ہونا چاہیئے۔ میں نے ان سے کہا کہ پنجاب کو بھی تقسیم ہونا چاہیئے۔ ورنہ آپ کے ساتھ ہندو اتنی بڑی تعداد میں شامل ہو جائیں گے کہ آپ کے لیے کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔

قائد اعظمؒ طالب علموں کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ وہ انہیں بہت وقت دیا کرتے اور انہیں ہر بات وضاحت سے سمجھایا کرتے تھے۔ یوں تو ان کی ہر تقریر ایک غیر معمولی واقعہ ہوتی تھی۔ مگر ۱۹۳۹ء میں انہوں نے مسلمانوں کی انفرادیت پر بہت سی تقریریں کیں۔ ان کی تقریروں میں واردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم کا ذکر خاص طور پر ہوتا۔ ان دونوں اسکیموں کا مقصد مسلمانوں کو ہندوؤں کے زیر اثر لانا تھا۔ ودیا مندر اسکیم بڑی تیاریوں سے اور ایک زبردست تحریک کی صورت میں پیش کی گئی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے خواجہ غلام السیدین کی مدد سے اسے تیار کیا تھا۔ اس کا مقصد مسلمانوں کا امتیاز ختم کر کے ہندوؤں کا غلبہ قائم کرنا تھا تاکہ اس طرح کی تعلیم و تربیت سے تمام مسلمانوں کا زاویۂ نظر ہندوستانی ہو جائے۔ کانگریسی وزارتوں نے جو اس وقت مختلف صوبوں میں برسر اقتدار تھیں، اس اسکیم کو مختلف ناموں سے رائج کرنے کی کوشش کی۔

قائد اعظمؒ نے ان تحریکوں کا کئی دفعہ ذکر کیا اور کہا کہ مسلمان اساتذہ کو ان کے مقابل اسکیمیں بنانی چاہئیں۔ چنانچہ میں نے اور مولانا حسرت موہانی نے اس سلسلے میں بہت سے مضامین لکھے۔ پھر یوپی مسلم لیگ نے ایک کمیٹی بنائی جس نے متبادل اسکیم تیار کرنے کی کوشش کی۔

پاکستانی تعلیم کا منصوبہ: ۱۹۴۷ء میں طے کیا گیا کہ پاکستان کے لیے تعلیمی منصوبہ بنایا جائے۔ مجھے اس کمیٹی کا کنوینر بنایا گیا۔ نواب اسماعیل خان صدر تھے۔ نوابزادہ لیاقت علی خان اعزازی طور پر نگران بنائے گئے۔ مختلف لوگوں نے اپنی علیحدہ علیحدہ رپورٹیں تیار کیں اور ان رپورٹوں کی بنیاد پر بعد میں پاکستان کے تعلیمی نظام میں ترمیمات بھی ہوئیں۔ یونیورسٹی سے متعلق تنظیم کے سربراہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور پروفیسر اے بی حلیم تھے۔ خواتین کمیٹی کی سربراہ بیگم محمد علی جوہر تھیں۔ فنی اور سائنسی تعلیم کی کمیٹی کی قیادت ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے سپرد کی گئی تھی۔ اور اسکولوں کے سلسلے میں جو کمیٹی بنائی گئی تھی۔ اس میں یو پی کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر تعلیمات غلام نبی قاضی اور آفتاب قاضی تھے۔

ایک مرتبہ مسلم لیگ کے کراچی سیشن کے دوران قائداعظمؒ نے مجھے شام کو اپنے یہاں بلایا۔ میں وہاں پہنچا تو نوابزادہ لیاقت علی خان بھی وہاں موجود تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ جب ہم ایک علیحدہ قوم بنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے لیے ثقافت، تہذیب، تعلیم حتیٰ کہ سائنس کے بنیادی رجحانات کا بھی تعین کرنا ہوگا۔ اس پر لیاقت علی خان بولے کہ اتنے چھوٹے سے کام کی کیا ضرورت ہے، بس ترکی کی طرح نصاب میں دینیات کی ایک درسی کتاب رکھ لیں۔ لیکن قائداعظمؒ نے فوراً ٹوکا: "لیاقت علی! یہ ماہرین پر چھوڑ دو! ہم انہیں تمام مواقع دیں گے۔" پھر ایسا ہی ہوا۔ تعلیمی کمیٹی کو اس سلسلے میں تمام اختیارات دے دیئے گئے۔

اجلاس لاہور: مجھے لاہور کے مارچ ۱۹۴۰ء کے تاریخی اجلاس میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا۔ قائداعظمؒ نے اس اجلاس میں عبداللہ ہارون کمیٹی بنائی تھی جس میں میرے علاوہ پروفیسر ڈاکٹر افضل (علی گڑھ)، پیر علی محمد راشدی (سندھ)، مولانا غلام رسول مہر (پنجاب)، ڈاکٹر عبداللطیف (حیدرآباد دکن) اور مولوی رضی اللہ (دہلی) شامل تھے۔ یہ کمیٹی قراردادوں کے مسودے بنا کر حاجی عبداللہ ہارون کے سپرد کر دیتی تھی اور وہ یہ مسودے قائداعظمؒ کو بھیج دیتے تھے۔

ان دنوں کچھ زیادہ جوش و خروش تھا۔ چند روز پیشتر لاہور میں خاکساروں کے

ایک جلوس پر فائرنگ ہوئی تھی) اس اجلاس کے ہیرو نواب بہادر یار جنگ تھے ان
کی تقریر بہت جوشیلی تھی۔ لاہور کا پورا شہر جذباتی طور پر اس اجلاس سے منسلک نظر
آتا تھا۔ قائداعظم نے اس اجلاس میں جو تقریر کی تھی اس سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ
اب وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا مشن مکمل کر چکے ہیں۔ یہ بات ان کے چہرے سے
صاف ظاہر تھی۔

پاکستان کی حمایت / مخالفت: قرارداد پاکستان کے منظور ہوتے ہی کانگریس
کے حلقوں سے اس کی زبردست مخالفت شروع ہو گئی۔ انگریز بھی اس کے سخت خلاف
تھے۔ پنجاب کے بہت سے زمیندار، جاگیردار اور بااثر لوگ حکومت پرست تھے۔ انہوں
نے اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یونینسٹ پارٹی کے سربراہ سر سکندر حیات نے
بھی اس تجویز سے اختلاف کرنا چاہا تھا۔ کانگریس اور حکومت برطانیہ نے ہر ممکن
مزاحمت کی۔ ان کی جانب سے مسلم لیگ کے مقابلے میں متبادل پارٹیاں بنانے
کی کوشش کی گئی۔ کانگریس نے جمعیت العلمائے ہند کو ہوا دی۔ انگریزوں نے
خاص طور پر پنجاب میں تحریک پاکستان کو ناکام بنانے کی کوشش کی۔ وہ چاہتے
تھے کہ کسی طرح پنجاب پاکستان کی تجویز کو مسترد کر دے۔ کیونکہ پنجاب منحرف ہو
جاتا تو معاملہ ختم ہو جاتا۔ البتہ بنگال کی قیادت اس معاملے میں زیادہ پرجوش تھی
خواجہ ناظم الدین، حسین شہید سہروردی اور مولوی فضل الحق اس تجویز کے پرجوش
حامیوں میں سے تھے۔

ہمیں معلوم تھا کہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ یو پی اور بہار
مسلم لیگ میں اس سوال پر اکثر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی حکومت
کہیں تو قائم ہو، کہیں تو ان کا بھی وطن ہو جہاں وہ اپنے مقاصد کے لیے جدوجہد
کر سکیں۔ جس طرح دنیا بھر کے یہودی اسرائیل کو اپنا وطن سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ہمارا
خیال تھا کہ پاکستان کو اپنا وطن بنائیں۔ قائداعظم نے کہا تھا کہ اقلیتی صوبوں کے
مسلمانوں نے اپنی ساری چیزیں اور اپنا مستقبل خطرے میں ڈال کر پاکستان کے

یہ کام کیا ہے۔ ان کا خیال رکھنا یہ پاکستان کے بانی اور معمار ہیں۔

علی گڑھ اور تحریک پاکستان : علی گڑھ میں بھی کچھ لوگ پاکستان کی تجویز کے مخالف تھے۔ جن میں جمعیت العلمائے ہند اور کانگریس کے صدر خواجہ عبدالمجید مخالفت کرتے تھے۔ اور یونیورسٹی میں بھی ان کے حامی کچھ لوگ تھے۔ مگر نوے فیصد سے زیادہ لوگ تحریک پاکستان کے حامی تھے۔ جو شخص بھی پاکستان کے لیے کچھ کر سکتا تھا۔ اس نے کیا۔ اسی زمانے میں پروفیسر حلیم، ڈاکٹر ضیاء الدین اور دوسرے پروفیسر صاحبان بھی اس تحریک میں شامل ہوئے۔

علی گڑھ کے طالب علم تو پچانوے چھیانوے فیصد تک مسلم لیگ کے ساتھ تھے۔ یہ لوگ پورے ہندوستان سے آئے تھے۔ انھوں نے تحریک پاکستان کے لیے صرف علی گڑھ میں ہی کام نہیں کیا بلکہ اپنے اپنے علاقوں میں جا کر بھی کام کیا۔ اس طرح مسلم لیگ کو چار پانچ ہزار طالب علم مبلغین مل گئے تھے۔ قائد اعظمؒ اکثر کہا کرتے تھے کہ علی گڑھ مسلمانانِ ہند کا اسلحہ خانہ ہے۔

۱۹۴۵ء میں انتخابات ہوئے تو میرے ساتھ بہت سے پروفیسروں نے میرٹھ مظفر نگر اور بلند شہر کا دورہ کیا تھا۔ میرے سپرد لیاقت علی خان کا الیکشن تھا۔ ان کا مقابلہ کانگریس کے محمد احمد کاظمی سے تھا۔ بہت سے طالب علموں نے بھی ہمارے ساتھ کام کیا۔ میں کلکتہ بھی گیا۔ علی گڑھ کے لوگ بمبئی، سندھ اور سرحد تک گئے۔

غرض کہ علی گڑھ کے پروفیسر اور طالب علم اس الیکشن میں سب جٹ گئے۔ یونین کا وائس پریذیڈنٹ ہمیشہ قائد اعظم کا خاص آدمی ہوتا تھا۔ جو بھی اس عہدہ پر ہوتا اس کی بڑی قدر افزائی کی جاتی تھی۔ قائد اعظمؒ جب علی گڑھ تشریف لاتے تو ان کا شاندار استقبال کیا جاتا۔ یونین میں ان کی تقریر ہوتی۔ ان کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے۔ اس زمانے میں شکیل بدایونی نے بھی ایک قصیدہ پڑھا تھا۔ "سلام اے قائد اعظم سلام اے قائد اعظمؒ" یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ شکیل اس زمانے میں یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ علی گڑھ کے بہت سے رئیس تھے جن میں حبیب الرحمٰن خان شیروانی (نواب

ذکر ہیں اور بلند شہر کے دوسرے رفقا بھی قائدِ اعظم کا ساتھ دیتے تھے۔ علی گڑھ میں
قائدِ اعظم، شیروانی صاحب کے مہمان ہوتے تھے۔

قائدِ اعظمؒ کا کردار: قائدِ اعظمؒ کی کیفیتِ مزاج کے بارے میں میرا تجزیہ یہ ہے
کہ ان کی زندگی میں بے پناہ نظم و ضبط تھا۔ ان کے گرد و پیش اس ڈسپلن کو کوئی نہیں
توڑ سکتا تھا۔ نہ کسی کمیٹی میں اور نہ ہی گھر میں۔ نہ کوئی طالب علم توڑ سکتا تھا اور نہ ہی
کوئی رشتے دار۔ دوسرے یہ کہ ان کے یہاں استدلال بہت زیادہ تھا۔ ان کی
گفتگو اور فیصلے ہمیشہ منطقی ہوتے تھے۔ بڑے بڑے جذباتی مسائل بھی پیدا ہوتے
لیکن وہ استدلال کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ مولانا محمد علی جوہر ہمیشہ جذبات
ہی سے کام لیتے تھے لیکن قائدِ اعظمؒ نے کبھی جذباتی تقریر یا جذباتی گفتگو نہیں
کی۔ تیسری چیز جو قائدِ اعظمؒ کے یہاں نمایاں تھی وہ مقصدیت تھی۔ جب وہ کوئی فیصلہ
کر لیتے تھے تو پھر انہیں دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔ چوتھی بات جو میں
نے محسوس کی وہ ان کی محنت تھی۔ بیماری کے باوجود مسلم لیگ کے جلسوں کی صدارت
کرتے۔ ورکنگ کمیٹی کے اجلاسوں میں شریک ہوتے۔ اور لیگ کے سالانہ جلسوں میں
گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ اسی زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا جسے میں خاص طور پر سنانا چاہتا
ہوں۔ ان پر قاتلانہ حملہ ہوا تو وہ اپنے سے چوگنے آدمی سے آدھ گھنٹے تک لڑتے
رہے۔ حملہ آور کے ہاتھ میں چاقو تھا اور یہ نہتے تھے!

قائدِ اعظمؒ میں ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ وہ کبھی شکست تسلیم نہیں کرتے
تھے۔ لیبر گورنمنٹ نے انہیں لندن بلایا تھا۔ عام طور پر سب کو معلوم تھا کہ لیبر گورنمنٹ
ہندوؤں کے ہاتھ بکی ہوئی تھی۔ مسٹر اٹیلی اس حکومت کے سربراہ تھے۔ قائدِ اعظمؒ لندن
جانے کے لیے کانپور کے اسٹیشن سے روانہ ہوئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت
بیمار ہیں۔ اور ان میں خون ختم ہو چکا ہے۔ لندن میں مذاکرات شروع ہوئے۔ تو قائدؒ
بالکل تندرست اور ترو تازہ معلوم ہوتے تھے۔

میں نے قائدِ اعظمؒ کو امیر اور غریب میں کبھی فرق کرتے نہیں دیکھا۔ ان کا [illegible]

ہمیشہ اہلیت، صلاحیت اور قابلیت ہوتا تھا۔ وہ کبھی کسی شخص، کسی قابل آدمی یا کسی استاد سے مرعوب نہیں ہوئے۔ اور انہیں اگر کسی سے جذباتی تعلق تھا تو صرف راجہ صاحب محمود آباد سے۔ راجہ صاحب کبھی قائد اعظمؒ سے ضد یا الجھتی بات کرتے تو وہ کہا کرتے تھے: "تمہیں سولی پر چڑھا یا جائے گا"۔ قائد اعظمؒ کبھی کسی بات کو اس وقت تک تسلیم نہ کرتے تھے جب تک وہ ان کی فکر واستدلال کے معیار پر پوری نہ اترتی ہو۔

میں نے کبھی قائد اعظمؒ کو کسی بھی محفل میں بے تکلف ہوتے نہیں دیکھا۔ صرف ایک واقعہ یاد ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کے یہاں دعوت تھی۔ کھانے میں مرچیں بہت تھیں۔ قائد اعظمؒ نے مرچوں کا یہ عالم دیکھا تو بولے: "جناب! میں کچھ نہیں کھا سکتا"۔ چنانچہ ان کے لیے ڈبل روٹی منگوائی گئی۔

وہ مسلم لیگ کے کارکنوں اور طالب علموں کے ساتھ بہت کشادہ دلی سے پیش آتے تھے۔

ڈاکٹر عمر حیات ملک

قائداعظم اور اسلامیہ کالج

قائداعظمؒ سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۲ء میں دہلی میں ہوئی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ان سے باتیں ہوئیں۔ سننے میں آیا تھا کہ قائداعظمؒ سختی سے بات کرتے ہیں مگر میں نے دیکھا۔ وہ نہایت ہی خلیق اور سراپا شرافت تھے اور کمال تہذیب و شائستگی سے بات کرتے تھے۔ غرور و تکبر ان میں نام کو نہ تھا۔

پاکستان کے متعلق آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کے سامنے برصغیر میں اپنی شخصیت کو برقرار رکھنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے ہندوؤں سے علیحدہ ہو کر اپنی ایک آزاد مملکت قائم کرنا۔ میں نے اس پر عرض کیا: "جناب یہ تو ٹھیک ہے مگر اس کے لیے ہمیں کچھ پراپیگنڈہ کرنا چاہیے۔ حصول آزادی کے لیے ہمارے پاس فوج یا ملکی اور وسائل تو ہیں نہیں۔ دوران گفتگو میں نے تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کی حمایت کے لیے ایک انگریزی اخبار کے اجراء پر بھی زور دیا تاکہ ہماری آواز باہر بھی پہنچ سکے۔ انہوں نے اس سے اتفاق کیا۔ میں نے عرض کیا پھر دقت کیا ہے؟ پیسے کا مسئلہ ہے تو آپ اپیل کریں لوگ دیں گے!" آپ نے کہا کہ "پیسے تو میں جمع کر سکتا ہوں، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ پیسے کس کے حوالے کروں؟" میں اس پر متعجب بھی ہوا مگر ان کا مطلب بھی سمجھ گیا۔ میں نے کہا کہ ایسا قحط الرجال

از نہیں کہ کوئی آدمی اس قابل بھی نہ ہو۔ پھر میں نے اس سلسلے میں چوہدری محمد علی اور مسٹر زاہد حسین کا نام لیا۔ انہوں نے کہا کہ ان کے پاس پہلے ہی بہت اہم کام ہیں۔ قائداعظم نے یہ بات اگرچہ یہیں ختم کر دی مگر اس واقعہ سے یہ اندازہ ہو گیا کہ قومی دیانتداری کے متعلق ان کا اندازہ خوشگوار نہ تھا۔ اور یہ صحیح بھی تھا۔

قائد کی شخصیت : قائداعظمؒ کی شخصیت میں چند باتیں بہت نمایاں ہیں۔ ایک تو ان کی دیانتداری دوسرے ان کی صاف گوئی، اور کسی سے مرعوب نہ ہونا۔ ہمارے لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر انگریزوں سے مرعوب تھے۔ اور ہندوؤں سے بھی! مگر قائداعظمؒ کسی سے بھی مرعوب نہیں تھے۔ انگریزوں کو بھی صاف صاف سنا دیتے مگر نہایت مہذب الفاظ میں! اسی طرح آپ ہندوؤں کو بھی کھری کھری سناتے تھے اور گاندھی جی کو خاص طور پر! چنانچہ گاندھی جی نے جب قائداعظمؒ سے ملنے کی خواہش کی تو انہوں نے کہا میں ملنے کو تیار ہوں بشرطیکہ آپ یہ جان لیں کہ آپ کانگریس کے لیڈر ہیں اور مسلمانوں کا لیڈر میں ہوں۔ مسلمانوں کی طرف سے میں بات کروں گا اور ہندوؤں کی طرف سے آپ بات کریں گے۔ قائداعظمؒ اس شرط پر بھی ملے۔

اس کے بعد قائداعظمؒ کی جس بات نے مجھے متاثر کیا وہ یہ تھی کہ انہوں نے پہلی مرتبہ ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ سمجھایا کہ تم محض اقلیت نہیں ہو بلکہ ایک الگ قوم ہو۔ اس سے پہلے سیاسی اور عوامی سطح پر کسی کو اس کام کی توفیق نہیں ملی تھی۔

اسلامیہ کالج اور تحریک پاکستان : قائداعظمؒ جب لاہور آئے تو میں اس وقت اسلامیہ کالج کا پرنسپل تھا۔ وہ اکثر جب بھی آتے تھے تو ان کا جلسہ اسلامیہ کالج کے گراؤنڈ میں ہوتا تھا۔ کیونکہ پنجاب میں وزارت یونینسٹوں کی تھی جس کے وزیراعلیٰ خضر حیات (اور ان سے پہلے سکندر حیات) نہیں چاہتے تھے کہ قائداعظمؒ کے جلسے ہوں۔ اس لیے جلسہ گاہ کے کھلے میدانوں میں پانی چھوڑ دیا جاتا تھا اور جلسوں کو روکنے اور درہم برہم کرنے کے لیے دوسرے طریقے

بھی اختیار کیے جاتے تھے۔ بہرحال اسلامیہ کالج کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ یہاں قائداعظمؒ کے جلسے منعقد ہوتے تھے۔ اس لیے مجھے بھی ان سے ملنے کا اکثر موقع ملتا تھا۔ ہمارے یہاں وہ تقریریں بھی کرتے اور ہمارے ساتھ کھانا بھی کھاتے تھے۔

قائداعظمؒ اپنی تقریروں میں مطالبۂ پاکستان کی وضاحت کرتے ہوئے بالعموم یہ فرماتے تھے:

”مسلمانو! تم ایک قوم ہو، تمہاری الگ تہذیب ہے، تمہارے الگ مقاصد ہیں اور تمہارے الگ علاقے بھی ہیں۔“

پاکستان کی تجویز پر شروع شروع میں تو لوگ ہنستے تھے اور خاص طور پر بڑے عہدیدار ہنسا کرتے تھے کہ پاکستان کیسے بن سکتا ہے؟ یہ ناممکن ہے۔ مگر قائداعظمؒ نے ہمت نہ ہاری اور لوگوں میں بھی پاکستان کی اہمیت کا احساس پھیلتا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۶ء کے قریب تو سب لوگ مسلم لیگ میں شریک ہو گئے۔ پاکستان کے ذکر پر جو لوگ ہنستے تھے وہ بھی قریب آنے کی کوشش کرنے لگے۔

ہندوستان کے اور علاقوں کی طرح پنجاب میں بھی مسلمانوں نے پاکستان کے لیے زبردست جوش و خروش اور قربانیوں کا مظاہرہ کیا۔ یونینسٹوں کے خلاف ایجی ٹیشن میں ہمارے طلباء کے علاوہ اساتذہ اور خود میں بھی جیل گیا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں اپنے مکان میں سو رہا تھا کہ کوئی بارہ بجے پولیس آئی۔ پہلے تو انہوں نے مجھے سول لائن تھانے میں لے جا کے بٹھا دیا۔ کچھ دیر بعد ایک لاری آئی اور مجھے اس میں سوار ہونے کو کہا گیا۔ اندھیرا تھا اور یوں لگا جیسے اس کے اندر بوریاں پڑی ہوئی ہیں۔ مگر جب میں نے ان بوریوں کو ٹٹولا تو جانے پہچانے لوگ نکلے۔ بولے ... ”آپ بھی آ گئے؟“ میں نے کہا۔ ”جی ...!“ تھوڑی دیر بعد ہمیں جیل پہنچا دیا گیا۔ مگر اس وقت قومی بیداری کا احساس اور جوش و خروش سب کے دلوں میں اس قدر موجزن ہو چکا تھا کہ جیل کا سارا عملہ ہم سے ایسے پیش آتا تھا جیسے وہ ہمارے ملازم ہوں۔

پاکستان اسلامی مملکت، یہ بات تو ہر ایک کے فکر و ذہن میں بس گئی ہے

کہ ان دنوں چھوٹے بڑے ہر ایک کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا۔ "پاکستان کا مطلب کیا؟ ۔۔ لا الٰہ الا اللہ" یہ یعنی مطالبۂ پاکستان کی بنیاد یہ جذبہ تھا کہ حصولِ پاکستان کے بعد ایک اسلامی ریاست بنایا جائے گا جس کی بنیاد اسلامی اصولوں پر ہوگی۔ اور جس کا نظام اسلامی عقائد اور روایات کا پابند ہوگا۔

یہ بڑے صدمے کی بات ہے کہ اس نصب العین کے حصول میں ہماری کسی قیادت نے سنجیدگی اور دیانتداری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ حالانکہ یہی لوگ تھے جنہوں نے پاکستان اور مسلم لیگ کے لیے انتخابی مہم کے دوران عوام سے بار بار وعدہ کیا تھا کہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنایا جائے گا۔ تاکہ مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلامی اقدار و تعلیمات کے مطابق ڈھال سکیں۔ اس سلسلے میں مجھے خود ایک ناگوار تجربے سے دوچار ہونا پڑا۔ قراردادِ مقاصد پر بحث کے دوران ایک صاحب نے مجھ سے کہا: "آپ کوٹ پتلون پہنتے ہیں، کوئی مولوی تو نہیں، پھر آپ کو کیا ضرورت ہے جو اسلام کے اس قدر پیچھے پڑتے ہیں؟" میں نے انہیں جواب دیا چاہے میں کتنا ہی گناہگار ہوں لیکن اسلام بہرحال میرا دین و عقیدہ ہے اور میرے وطن کے دونوں حصوں یعنی مشرقی اور مغربی پاکستان میں اسلام کے سوا کوئی اور رابطہ نہیں۔ اگر ہمیں ان دونوں حصوں کو یکجا و متحد رکھنا ہے تو اسلامی نظام اور پاکستان کو جوڑنا ہوگا۔

یہ صاحب تحریکِ پاکستان اور مسلم لیگ کے اہم لیڈر تھے اس لئے میں نے ان سے جوابًا پوچھا جناب پاکستان بننے سے پہلے آپ "پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ" کا ورد کرتے تھے اب آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ آپ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے مخالف ہیں بن گئے؟

چودھری محمد علی

تقسیم ہند کا مرحلہ

اکتوبر ۱۹۴۶ء میں عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی شمولیت طے پا گئی تو وائسرائے
کی توسیع شدہ ایگزیکٹو کونسل میں نوابزادہ لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر اور دوسرے
مسلم لیگی وزراء شامل تھے۔ محکموں کی تقسیم کا مسئلہ درپیش ہوا تو قائد اعظمؒ کی خواہش
تھی کہ دفاع اور وزارت داخلہ مسلمانوں کے پاس رہے۔ محکمۂ دفاع سردار بلدیو سنگھ
کے پاس تھا۔ ہندو کہتے تھے کہ انہیں نہیں ہٹایا جا سکتا۔ میں نے قائد اعظمؒ سے کہا کہ
داخلہ کا محکمہ حاصل کرنا تو ٹھیک ہے لیکن داخلہ میں کیا رکھا ہے؟ اس کا بیشتر حصہ تو
صوبوں کے پاس ہے۔ اگر ہندو سمجھتے ہیں کہ مسلمان محکمۂ خزانہ کا کام نہیں سنبھال سکتے
تو یہ ان کی بھول ہے۔ آپ اس کو منظور کر لیجیے۔ یہ میری قائد اعظمؒ سے پہلی ملاقات
تھی۔ دوسری ملاقات میں نوابزادہ لیاقت علی خان بھی موجود تھے۔ میں نے دوبارہ
اپنا خیال ظاہر کیا اور ذمہ داری بھی لی کہ آپ خزانے کا محکمہ قبول کر لیں، چلانا میرا کام ہے۔
مالیات سے میرا بہت قریبی رابطہ تھا اس لیے میں ہندوؤں کے اس دعوے کے کھوکھلے پن
کو کہ مسلمان یہ نظام نہیں چلا سکتے، خوب جانتا تھا۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ محکمۂ خزانہ کو بعض
معاملات میں دفاع سے کہیں زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ لیاقت علی خان خاصے متامل
تھے۔ لیکن قائد اعظمؒ مان گئے۔ اور محکمۂ خزانہ مسلم لیگ کو اور لیاقت علی خان کو ملا۔ انہوں
نے نہایت کامیابی سے چلایا اور ہر بجٹ پر مسلمانوں کی اہلیت و صلاحیت کا سکہ بٹھا

دیا۔ ایسا بجٹ نہ کبھی پہلے پیش ہوا تھا نہ بعد میں پیش کیا جا سکا۔

تقسیم کے فیصلے کے بعد بنگال، پنجاب اور مرکز کے لیے تقسیم کمیٹیاں بنائی گئیں۔ اس میں وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن، قائداعظمؒ، نوابزادہ لیاقت علی خان، سردار پٹیل، سی۔ راجگوپال اچاریہ اور سردار بلدیو سنگھ شامل تھے۔ کبھی کبھی مسٹر جواہر لال نہرو بھی اجلاس میں شریک ہوتے لیکن وہ اس کام میں زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کرتے تھے جب کہ قائداعظمؒ بہت زیادہ دلچسپی لے رہے تھے۔ تقسیم کمیٹی کے دو سیکرٹری تھے ہندوؤں کی طرف سے پٹیل اور مسلمانوں کی طرف سے میں! اس زمانے میں مجھ کو قائداعظمؒ کے بہت قریب رہنے اور ان کی شخصیت کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان بن گیا۔ قائداعظمؒ پاکستان کے گورنر جنرل بنے اور لیاقت علی خان کو وزیر اعظم بنایا گیا۔ میرا تقرر حکومت پاکستان کے سیکرٹری جنرل کے عہدے پر ہوا یعنی ملک کے تمام امور حکومت اعلیٰ سرکاری سطح تک میرے ہی ذریعے سے پہنچتے تھے۔

قائداعظمؒ سے میری آخری ملاقات ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہوئی۔ وہ اپنی علالت کے سبب تبدیلی آب و ہوا اور علاج کے لیے زیارت گئے ہوئے تھے لیکن ۹ ستمبر کو جب میں قائداعظمؒ سے ملنے گیا تو وہ کوئٹہ میں مقیم تھے۔ اس وقت کشمیر کا جھگڑا چل رہا تھا۔ یہ مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش تھا۔ وہاں اقوام متحدہ نے ایک مبہم قرارداد منظور کی۔ تو پاکستانی کابینہ نے اسے نامنظور کر دیا حکومت پاکستان اس میں ایک حتمی ترمیم کرانا چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں قائداعظمؒ کی منظوری درکار تھی۔ جب میں ۹ ستمبر کو کوئٹہ میں قائداعظمؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ بے حد کمزور اور نحیف ہو چکے تھے لیکن ذہن حسب معمول تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے اقوام متحدہ کی قرارداد کے متعلق حکومت پاکستان کابینہ کے موقف کو قائداعظمؒ کے روبرو پیش کیا۔ قائداعظمؒ نے دونوں مسئلوں کو غور سے سننے کے بعد حکومت پاکستان کے موقف کو قبول کر لیا۔ اور میں کراچی لوٹ آیا۔ اس مہینے کی ۱۱ تاریخ کو قائداعظمؒ ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔

جسٹس ابو سعید چودھری

بلند کردار اور صاحب عزم

میری رائے میں قائد اعظمؒ کی سیاسی زندگی کا سب سے زیادہ شاندار دور اس وقت شروع ہوا جب ۱۹۳۴ء میں وہ دوبارہ سیاست کے میدان میں اس عزم کو لے کر سامنے آئے کہ وہ مسلمانوں کو متحد و منظم کر کے ان کی اجتماعی جدوجہد کا صحیح رخ متعین کریں گے۔ قائد اعظمؒ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کریں، اپنی گم گشتہ روح حیات کی پھر سے جستجو کریں اور اپنی تاریخ کے اس شاندار دور کو بھی یاد رکھیں کہ وہ اس برصغیر میں سات سو سال تک حکمرانی کر چکے ہیں۔ انہوں نے اس بات کا تہیہ کر لیا تھا کہ جنگ پلاسی کے بعد مسلمانوں کو جس ذلت و زوال کا سامنا کرنا پڑا وہ انہیں اس سے نجات دلانے کے لیے متحد کریں گے اور ان میں تازہ ولولہ ہمت اور عزم پیدا کر کے انہیں پھر سے جدوجہد پر آمادہ کریں گے۔

جس زمانے میں وہ لندن میں مقیم تھے، انہیں ہندوستان کے حالات کے بارے میں سلہٹ کے عبدالمتین چودھری اور دوسرے مسلم لیڈر مطلع کرتے رہتے تھے۔ اور بہت سے لوگوں نے ان سے واپس آنے کے لیے اصرار بھی کیا تھا لیکن قائد اعظمؒ نے وہاں مکان خرید لیا تھا۔ اور وکالت شروع کر دی تھی وہ وہاں آرام و سکون کی زندگی گزار رہے تھے۔ پھر وہ یہ بھی سوچتے تھے کہ ہندوستانی

واپسی کا ان حالات میں فی الواقع مفید بھی ثابت ہوگا یا نہیں۔ ایسے حالات میں ہر شخص کو فیصلہ کرنے کے لیے مہلت درکار ہوتی ہے۔

اگرچہ قائداعظمؒ نے عبدالمتین چودھری کی دعوت کو فوری طور پر منظور نہیں کیا تھا لیکن اس پر غور ضرور کیا ہوگا۔ جیسا کہ اپنے اور بہت سے دوسرے دوستوں مثلاً دیوان چمن لال کے تقاضوں کو انہوں نے ہندوستان واپس آنے کے فیصلہ کرنے میں ضرور ملحوظ رکھا۔ چنانچہ جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء منظور ہوا تو قائداعظمؒ کے لیے ان ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کا موقع میسر آ گیا۔ وہ وطن واپس آئے اور انہوں نے برصغیر کے تمام مسلمانوں کو متحد و منظم کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ اور ہندوستان کے مسلمان لیڈروں کے تعاون سے مسلمانوں میں عزم و عمل کا ایسا زبردست جوش و خروش پیدا کر دیا جس کی مثال نہ صرف اس برصغیر کی تاریخ میں بلکہ کسی ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہاں غیر منقسم بنگال میں ان کی بھرپور تائید و حمایت حسین شہید سہروردی جیسے لائق، ذہین و صاحب عزم و ہمت شخص نے کی۔ حسین شہید سہروردی نے یونائیٹڈ مسلم پارٹی (متحدہ مسلم پارٹی) کے نام سے ایک سرگرم جماعت کی تنظیم کی۔ اس یونائیٹڈ مسلم پارٹی کی اساس پر بعد میں آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیم نو ہوئی اور اس نے پھر انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ بعد ازاں ۱۹۴۰ء میں لاہور میں مولوی فضل الحق نے وہ یادگار قرارداد پیش کی جو "قرارداد پاکستان" کے نام سے مشہور ہے۔ ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے اس قرارداد کو بیک زبان منظور کر لیا۔ اور اس طرح دو قومی نظریہ تمام مسلم لیگ میں مقبول ہو گیا۔ میری رائے میں تو اس قرارداد کی منظوری کے ساتھ ہی برصغیر میں ایک نئی قوم معرض وجود میں آ گئی۔

پاکستان کا جواز: قائداعظمؒ جانتے تھے۔ اگرچہ مسلمان ہندوستان کے مختلف علاقوں اور صوبوں کے باشندے تھے۔ لیکن ان سب کی ملی میراث اور ثقافت

ایک ہی تھی۔ وہ سب ایک ہی تہذیب و تمدن سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے
اور ان کے ساتھ پوری قوم نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک ایسی قوم کے لیے جس کے افراد کا
مذہب بھی اور اخلاق کردار، تہذیب و تمدن ایک ہو، ایک علیحدہ وطن ہونا چاہیے
یہی تقاضے علیحدہ وطن یعنی پاکستان کے قیام کا سبب بنے۔

قائداعظمؒ نے اپنی سیاسی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں محسوس کر لیا تھا کہ اس
قوم کے ساتھ جو ہندوستان میں اقلیت کا درجہ رکھتی تھی۔ اکثریت والی قوم منصفانہ
سلوک نہیں کر رہی۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ مروجہ جمہوری نظام میں مسلمان اپنی آبادی
کی بنا پر ہمیشہ اقلیت ہی میں رہیں گے اور اس طرح اکثریت یعنی ہندوؤں کے
جبر و تشدد کا ہمیشہ نشانہ بنے رہیں گے۔ ہندوستان کی تقسیم کی بنیاد جداگانہ قومیت
جداگانہ ثقافت جداگانہ تہذیب و تمدن ہی تھی۔ تہذیب کا فرق اس کی اہم وجہ
تھا۔ مجھے اس موقع پر قائداعظمؒ کی وہ تقریر یاد آ رہی ہے جو انھوں نے ہالبورن
ہال لندن میں برطانیہ کے معتبر لوگوں اور ہندوستانی طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کی
تھی۔ یہ دسمبر ۱۹۴۶ء کا ذکر ہے۔ قائداعظمؒ نے مائیکروفون پر آتے ہی فرمایا: "میں آپ
کے سامنے مسلم لیگ کا موقف پیش کرتا ہوں" اور اس کے بعد انھوں نے تحریک
پاکستان کی تاریخ بیان کرتے ہوئے پاکستان کے مطالبے سے عام مسلمانوں کی
توقعات اور امنگوں کا ذکر کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے مسلمانوں کی اقتصادی خوش
حالی پر بھی زور دیا تھا لیکن یہ واضح کیا کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان اسلام
کے پیرو ہونے کے باعث اقتصادی اور صنعتی میدانوں میں اپنے جائز حقوق حاصل
کرنے سے محروم رہے تھے۔

بلند کردار قائد: قائداعظمؒ جیسا صاحب کردار، دیانت دار اور غیر جذباتی
لیڈر مسلمانوں کو اس سے پہلے نہیں ملا تھا۔ ان کے دشمن بھی ان کی بلند کرداری
اور ایمانداری کے قائل تھے۔ وہ پہاڑ کی طرح ارادے کے پکے تھے۔

مجھے قائداعظمؒ کے بلند کردار اور صاحب عزم ہونے کے سلسلے میں ایک واقعہ

یاد آگیا۔ آپ کو علم ہوگا۔ ہندوؤں کا اخبار "آنند بازار پتریکا" مسلمانوں اور مسلم لیگ کے خلاف مسلسل زہر افشانی کیا کرتا تھا۔ اس کا ایڈیٹر مسٹر سیتندر ناتھ موجمدار شمالی کلکتہ کا ہی رہنے والا تھا اور میرے محلے سے اس کا گھر کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ ہم دونوں کے خاندانوں میں میل جول تھا۔ میری اس کی اس وقت سے ملاقات تھی جب ہم دونوں کالج میں پڑھتے تھے۔ ایک دن موجمدار نے مجھ سے کہا۔ "جانتے ہو کہ تمہارے مسٹر جناح کس قدر ضدی آدمی ہیں۔ اگر ہم ہندوستان کی بادشاہت بھی انہیں پیش کر دیں تب بھی وہ اپنے مطالبۂ پاکستان سے دستبردار نہیں ہوں گے۔"

"آنند بازار پتریکا کے ایڈیٹر کے اس بیان سے زیادہ شاندار خراجِ عقیدت بھلا قائد اعظمؒ کے لیے اور کیا ہو سکتا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ اس سے بہتر ان کی راست بازی اور پختہ ارادے کی تعریف و توصیف کسی اور نے شاید ہی کبھی کی ہو۔ اس واقعہ سے یہ بھی اندازہ لگا لیجیے کہ ان کے دشمن بھی جانتے تھے کہ قائد اعظمؒ کا کردار کس قدر بلند اور اعلیٰ تھا۔

ہندوستان کے سب ہی مسلمانوں نے ۴۶-۱۹۴۵ء کے انتخابات میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیے تھے۔ یہ درست ہے کہ اس وقت ان کے سامنے جو پاکستان کا تخیل تھا وہ اس سے مختلف تھا جو قائد اعظمؒ کو شدید ناموافق حالات کے دباؤ کے باعث بلا توقف منظور کرنا پڑا۔ یقین کیجیے اس سے کسی شخص کو اتنا دکھ نہیں ہوا تھا جتنا خود قائد اعظم کو ہوا تھا۔ ان کے سامنے یہ دو ٹوک سوال آیا کہ اگر ملتا ہے تو ایسا ہی پاکستان لینا پڑے گا یا پاکستان کے مطالبے سے قطعاً دستبردار ہونا پڑے گا۔ قائد اعظمؒ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ساری آبادی کو ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے سے کہیں بہتر ہے کہ مسلمانوں کے لیے جس طرح کا بھی ہو ایک علیحدہ وطن حاصل کر لیا جائے جہاں وہ اپنی مرضی و منشا کے مطابق آزادانہ زندگی بسر کر سکیں۔ جس سے ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کو بھی تقویت ملتی رہے۔

تقسیم ہند کی یادیں

غالباً ۳۰ جون یا یکم جولائی ۱۹۴۷ء کی بات ہے کہ قائد اعظم نے مجھے ٹیلیفون پر کہا کہ "باؤنڈری کمیشن قائم ہونے والا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ پنجاب کے باؤنڈری کمیشن میں تم پنجاب کی سرحدوں کے معاملے میں پاکستان کی نمائندگی کرو۔" میں نے کہا کہ میں حاضر ہوں۔"

باؤنڈری کمیشن

بعد ازاں جب میں قائد اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا۔ "تمہیں باؤنڈری کمیشن کے سامنے پاکستان کا کیس پیش کرنا ہے لہٰذا تم تیاری کرو۔" میں نے عرض کیا کہ آپ کوشش کریں کہ ریپار (ثالث) لارڈ کے منصب کا وکیل یا قانون دان ہو۔ قائد اعظم نے یہ تجویز پیش کی کہ تین لاء لارڈز پر مشتمل کمیشن بنایا جائے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن فیصلہ کر چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بہانہ بنایا کہ لاء لارڈز بوڑھے لوگ ہوتے ہیں گرمی کا زمانہ ہے۔ ہندوستان میں گرمی بہت شدید ہوتی ہے اس لیے ان کو زحمت دینا مناسب نہیں۔" چنانچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سر سیرل ریڈکلف کا تقرر کرایا۔ یہ ممکن ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ریڈکلف جب وہ دہلی آئے اور لاہور۔ انہیں وائسریگل لاج میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ان کا سارا عملہ وائسرائے

سے باہر نہیں جاتے تھا۔ ہر طرح کے لوگ ڈسٹرکٹ لیول میں ان تک پہنچ سکتے تھے
یہ باتیں شکوک پیدا کرنے والی ضرور تھیں۔ لارڈز کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم و
تربیت اور نشست و برخاست عام لوگوں سے الگ تھلگ ہوتی ہے۔ اس لیے
ان پر دباؤ ڈالنے یا اثر انداز ہونے کے امکانات بہت محدود ہوتے ہیں بہرحال
یہ تو ہونا تھا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ریڈکلف کا تقرر کرا دیا۔

ریڈکلف پارلیمنٹ کے رکن تھے اور وکالت ان کا پیشہ تھا۔ انھوں نے کئے
ہی کام شروع کر دیا (پاکستان کی طرف سے میرے علاوہ جسٹس شیخ دین محمد اور
جسٹس محمد منیر نمائندہ تھے) ایک بات یقینی ہے اور اس کا ذکر میں نے اپنی کتاب
ر میں تفصیل سے کیا ہے وہ بات یہ ہے کہ مسٹر
ریڈکلف صاحب نے ہم کو بلایا تھا۔ دوسرے دن یعنی غالباً دوپہر کا وقت تھا،
شیخ دین محمد میرے پاس آئے اور فرمایا کہ "چودھری صاحب باؤنڈری کمیشن کے
سامنے کیس آپ کو پیش کرنا ہے۔ ہم سے جو کچھ بن پڑے گا کریں گے کیونکہ فیصلے کا
ہم سب پر آتا ہے کمیشن کے سامنے ہم کیا کہتے ہیں لیکن حد بندی کا فیصلہ تو ہو
چکا ہے آپ سے جو ممکن ہو کوشش کر دیکھئے۔"

میں نے کہا "شیخ صاحب یہ بات آپ کو کیسے معلوم ہوئی کہ ہم کچھ نہیں کر
سکتے یہ کیسے ہوا؟" شیخ دین محمد نے کہا "آپ جب چلے آئے تو ریڈکلف نے
ایک ہوائی جہاز کے ذریعے سرحدی علاقوں کے دورے کا پروگرام بنایا تو جسٹس
محمد منیر نے ریڈکلف سے کہا "ہمیں کیسے معلوم ہوگا کہ آپ نے کیا دیکھا اور آپ کا
فیصلہ کیا ہے؟" ریڈکلف نے کہا کہ "جہاز پانچ نشستوں کا ہے۔ ایک پائلٹ ہوگا
ایک میں، ایک آپ اور ایک ہندوستان کا نمائندہ ہوگا۔" جسٹس منیر صاحب کا کہنا ہے کہ
"والٹن کیمپ پر ہوائی جہاز کھڑا تھا۔ وہاں پہنچے تو پائلٹ نے کہا کہ صاحب اس
وقت مطلع ابر آلود ہے اوپر جا کر دوسری طرف بھی یہی حال ہوگا۔ چنانچہ ریڈکلف
نے ہوائی سفر کا ارادہ ترک کر دیا۔ ریڈکلف کا ارادہ تھا کہ وہ پٹھان کوٹ کے

قریب جہاں دریائے راوی میدان میں داخل ہوتا ہے، نقشانی جائزہ لیا ہوا۔
مختلف گاؤں وغیرہ لاہور کے مشرق میں دیکھتا ہوا فیروزپور تک جاتا۔ اس سے
اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے سرحد کا تعین کر لیا تھا اور جن علاقوں کو وہ دیکھنا چاہتا
تھا وہ ہماری پیش کی ہوئی تجویز سے مختلف تھے۔ شیخ دین محمد نے مجھے رائے دی کہ
میں اور منیر صاحب دہلی جا کر قائداعظم سے عرض کریں کہ ہم اس عہدے سے مستعفی
ہونا چاہتے ہیں لیکن میں نے کہا کہ قائداعظم قانون دان آدمی ہیں۔ یہ بات قانونی
طریقے سے ان کے سامنے پیش کی جانی چاہیے ویسے مجھے یہ شبہ ہے کہ وہ قبول کر
لیں گے۔ بہرحال آپ صاحبان ان سے جا کر کہیں کہ ریڈکلف یہ کچھ کر رہا ہے اس
سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے ارادے کیا ہیں؟ لہٰذا قائداعظم، ماؤنٹ بیٹن یا ریڈکلف
سے دریافت کریں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کیا قانون کے فیصلے کے مطابق یہ اقدام کیا
جا رہا ہے، اس کے پس منظر میں کیا عوامل ہیں اور کون لوگ ریڈکلف کو اس قسم
کی پٹی پڑھا رہے ہیں؟ اس طرح شاید قائداعظم اس پر غور کرنے کے لیے آمادہ
ہو جائیں۔

چنانچہ جسٹس شیخ دین محمد اور جسٹس محمد منیر بدھ کی شام کو گئے اور جمعرات کو
واپس آ گئے۔ اسٹیشن سے میرے پاس آتے ہوئے گئے اور کہا کہ صاحب قائداعظم
نہیں مانے، وہ کہتے ہیں کہ ہم نے ریڈکلف کو مسلسل یا متصل علاقے کا مطلب
سمجھا دیا ہے۔ اب آپ لوگ جائیں اور اپنی انتہائی کوشش کریں۔ ابھی چند دن
ہوئے مجھے سید واجد علی نے بتایا کہ وہ بھی شیخ دین محمد اور منیر صاحب کے ساتھ
دہلی گئے تھے لیکن پیچھے کہ ریڈکلف نے اسی ارادے کے مطابق موجودہ تقسیم ہونا
اور شاید پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق تقسیم عمل میں آئی اور اس میں بھی یہ
فرق بالکل آخر میں ہوا کہ فیروزپور اور زیرہ کی تحصیلیں علیحدہ کر کے ہندوستان کو دے
دی گئیں۔

کچھ عرصے بعد قائداعظم نے مجھے طلب کیا اور فرمایا کہ اگر ہم متحد ہو سکتے

کی رکنیت کا مسئلہ پیش ہوگا" میں چاہتا ہوں کہ اس میں تم پاکستان وفد کی رہنمائی کرو۔
اقوام متحدہ سے واپسی پر میں نے قائد اعظم کو وہاں کے حالات کی تفصیلات پیش کیں۔
قائد اعظم نے دریافت فرمایا کہ اب تمہارا کیا ارادہ ہے۔ میں نے کہا کہ میں بھوپال جا
رہا ہوں۔ انھوں نے فرمایا کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان اب لاہور میں ہیں ان سے
ملتے ہوئے جانا۔ ساتھ ہی یہ کہا کہ یہ دو ہفتہ کام ختم کر کے مجھے تمہاری یہاں ضرورت ہے
بھوپال جانے کے لیے میں لیاقت علی خان صاحب کی خدمت میں لاہور پہنچا۔
ان سے ملاقات کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے کہا میں چیف جسٹس کی ضرورت
ہے تاکہ وہ اپنا عملہ اور طریق کار وغیرہ مقرر کرے اور وزارت خارجہ بھی خالی ہے۔
ان حالات میں اگر تم بھوپال میں مسلمانوں کی زیادہ خدمت کر سکتے ہو تو ٹھیک ہے
ورنہ مسلمانوں کا کام کرنے کے لیے یہاں بھی تمہاری ضرورت ہے۔
لیاقت علی خان صاحب نے میرا بھوپال جانے کا انتظام کر دیا اور وقتی
طور پر میں بھوپال چلا گیا۔

تنازعہ کشمیر

تنازعہ کشمیر کی داستان خاصی طویل ہے مگر میں اختصار سے کام لوں گا۔
ہوا یوں کہ جنوری ۱۹۴۸ء میں ہندوستان نے اقوام متحدہ سے سلسلہ جنبانی
کی۔ وہی جنوری کو بحث شروع ہوئی۔ ۲۰ جنوری کو ایک قرارداد تیار کی گئی جس
سے پاکستان متفق تھا۔ اس کا نفس مضمون یہ تھا کہ ریاست کی ترتیب میں اور وہاں
والے جو جاری کی گئی ہے تو نئے عامہ اس میں شامل نہیں تھی۔ اس پر اگر ہندوستان
ایک طرز جمہوریت سے فیصلے کو نہ مانے یا دنیا میں جنگ کرے تو تنازع کا حق پاکستان
اور ہندوستان دونوں کو حاصل ہونا چاہیے اس سے پہلے برطانوی وزیر مسٹر فلپ
نوئل بیکر نے مجھ سے کہا تھا کہ ظفر اللہ خان تمہارا سب سے بڑا وکیل خود شیخ عبداللہ
ہے جو ہندوستان کے وفد میں شامل ہے اور اقوام متحدہ میں تقریر بھی کر چکا ہے۔

خیر تو ہوا یہ کہ سلامتی کونسل کے بیشتر ارکان نے پاکستان اور مجوزہ قرارداد کے مسودے
کے حق میں تقریریں کیں۔ اس پر ہندوستانی وفد کے لیڈر مسٹر گوپالا سوامی آئینگر
نے کہا کہ میری حکومت نے بذریعہ ٹیلی گرام مجھ کو بلایا ہے لہٰذا بحث ملتوی کی جائے
یہ تعطل پیدا کرنے کی پہلی کوشش تھی۔ اس پر سب حیران ہو گئے بلکہ سلامتی کونسل میں
کولمبیا کے نمائندے نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ صاحب صدر چند دن ہوئے ہندوستان
کے وفد نے کہا تھا کہ کشمیر جل رہا ہے اور سلامتی کونسل نیرو کی طرح بنسری بجا رہی ہے؟
تو اب بحث ملتوی کرنے کا کیا یہ مطلب ہے کہ کشمیر میں آگ بجھ گئی ہے؟ بہر حال اس
کے بعد کشمیر کے مسئلے میں یکے بعد دیگرے روڑے اٹکائے جاتے رہے۔

ہم لوگ اقوام متحدہ میں رہے۔ پھر طے ہوا کہ دونوں فریق لندن میں بات کریں
وہاں معلوم ہوا کہ سر اسٹیفورڈ کرپس اور وزیر اعظم ایٹلی دونوں پاکستان کے خلاف ہیں
بلکہ (بعد میں تیموریسن اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی بات سے سخت مخالف تھے)۔ ذاتی طور
پر قائد اعظم سے انہیں بہت پرخاش تھی۔ اسٹیفورڈ کرپس سازشی آدمی تھا۔ کیبنٹ مشن
کے دوران میں اس نے مسلم لیگ کے کاغذات تک بالا بالا کانگریس وفد کو دکھا
دیئے تھے۔ ایٹلی اول دن سے تقسیم کے خلاف تھا اور عمر بھر خلاف رہا۔ یہی بات
قائد اعظم سے اس کی دشمنی کا سبب بنی۔ ماؤنٹ بیٹن کا معاملہ یہ تھا کہ نہرو سے
اس کی گہری دوستی تھی۔ تقسیم کے کام میں ایٹلی کی ہدایت اور اپنے رجحان کی وجہ سے
پاکستان کو ہر طرح نقصان پہنچانے کے بعد وہ دونوں ملکوں کا گورنر جنرل بننے کا خواہاں
تھا حالانکہ قائد اعظم نے اس کو ایک بہت اچھی تجویز پیش کی تھی کہ گورنر جنرل دونوں
ملکوں کے الگ الگ ہوں اور ماؤنٹ بیٹن تاج برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے
تقسیم ہند کے جملہ امور کے تصفیہ کی نگرانی کرے اور اس کا عہدہ وائسرائے یا مشیر کا ہونا
چاہیے لیکن اس کے جاہ پسند اور سازشی دماغ کو یہ تجویز پسند نہ آئی اور پاکستان
اور قائد اعظم سے اس کی دشمنی تا عمر رہی اور [illegible] گورنر جنرل نہ بن سکنے کا رنج ایسا تھا
کہ اس نے پاکستان کی علیحدگی پر یہی کہا کہ تقسیم غلط تھی اور میں اس کے خلاف تھا۔

قائداعظمؒ کی شخصیت

قائداعظم کی شخصیت کی بہت سی باتیں خود ان کی زندگی میں زبان زد ہو چکی تھیں جن کا تعلق انسانی تعلق اور کوششوں کا دخل ہے۔ اگر قائداعظم نہ ہوتے تو پاکستان نہیں بن سکتا تھا۔ عزم صمیم اور ذہانت سے اپنا کیس تیار کرنا، تندہی، دیانت داری اور جانفشانی سے کام کرنا یہ ان کی بڑی اعلیٰ خصوصیتیں تھیں۔ میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ایک مرتبہ پاکستان کی کابینہ کا اجلاس گورنر جنرل ہاؤس میں تھا۔ (عموماً کابینہ کا اجلاس وزیراعظم کی کوٹھی پر ہوتا تھا لیکن جب قائداعظم چاہتے تو گورنر ہاؤس میں بھی میٹنگ ہوسکتی تھی) اس میٹنگ میں قائداعظم نے کہا کہ میں نے اپنی رائے بیان کر دی ہے لیکن اگر ایسا ہو کہ کسی معاملے میں کابینہ کی اکثریت میری رائے کے خلاف ہو تو فیصلہ کیسے ہوگا؟ آپ صاحبان کیا کریں گے؟ اس غیر متوقع سوال پر ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ وزیراعظم لیاقت علی خان نے کچھ مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی مگر خود قائداعظم نے کہا کہ اگر کابینہ کی اکثریت کوئی فیصلہ کرتی ہے تو اس کی ذمے داری بھی مجھ پر عائد ہوگی۔ لہٰذا اس پوائنٹ کو واضح ہونا چاہیے۔ دوسری صورت میں مجھے لوگوں پر واضح کرنا ہوگا کہ فیصلہ اور ذمے داری میری نہیں آپ کی یعنی کابینہ کی ہے۔

• مولانا ظفر احمد انصاری

مسلم لیگ کی تنظیم

قائداعظمؒ سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۲ء میں ہوئی۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں نے مجھے پیش کش کی کہ میں اسسٹنٹ سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ کی حیثیت سے ان کی مدد کروں۔ میں نے یہ ذمہ داری اس شرط کے ساتھ قبول کی کہ مسلم لیگ کے مالی مسائل سے میرا تعلق نہیں ہوگا، اور میں صرف تنظیمی معاملات کی نگرانی کروں گا۔ اس گفتگو کے تھوڑے ہی عرصہ بعد قائداعظمؒ دہلی تشریف لائے تھے اور نوابزادہ لیاقت علی خاں مرحوم نے ان سے میری ملاقات کرائی۔ یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ ہم تقریباً آدھے گھنٹے تک گفتگو کرتے رہے۔ قائداعظم نے کہا کہ "ہندوؤں میں بہت سے ایسے باصلاحیت لوگ ہیں کہ جنہوں نے سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کو بہت معمولی معاوضہ پر (جو محض گزارے کے لئے ہے) اپنی خدمات وقف کر دی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ایسے لوگ ہونے چاہئیں۔ ہماری قوم کے نوجوانوں اور بڑوں کو بھی اسی طرح ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔" قائداعظم نے کہا کہ "کام کے بہت سے میدانوں میں ہمیں باصلاحیت افراد کی ضرورت ہے۔ خود لیگ کے دفتر کو جتنا مستعد ہونا چاہیے، اتنا مستعد نہیں ہے۔ اس کے لئے محنت اور ایثار کی ضرورت ہے۔ کیونکہ تحریک کا کام بڑھ رہا ہے۔"

۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا۔ مسلم لیگ کافی مقبولیت حاصل کر چکی تھی لیکن تنظیمی ڈھانچہ کمزور تھا۔ قائداعظم چاہتے تھے کہ اس پہلو پر اور ان میدانوں میں کام کرنے کی

ضرورت ہے ہمیں اپنی تنظیم کو زیادہ مستعد اور باصلاحیت بنانا چاہئے۔ سیاسی کام کو
منظم کرنا ہے۔

پہلی ملاقات ہی میں قائد اعظم کی شخصیت سے میں نے جو تاثر قبول کیا وہ بعد میں
اور زیادہ ابھرا ہو گیا۔ مجھے شدت سے احساس تھا کہ قائد اعظم یہ سمجھتے ہیں کہ انگریز یہاں
سے جانے سے پہلے اس ملک کی تقسیم ہندوستان سے کر کے جائیں گے اور اپنے اس فرض کو
ایمانداری کے ساتھ ادا کریں گے۔ وہ کوشش کریں گے کہ جیسے پہلے پاکستان وطن نہ
ہو گا میرا خیال یہ تھا کہ خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ دراصل بات یہ تھی کہ میں دہلی میں جس
مکان میں رہتا تھا۔ اس کے سامنے چودھری ہاؤس نامی ایک عمارت تھی جو نواب چھتاری
کی ملکیت تھی۔ انہوں نے یہ عمارت خلافت کمیٹی کو دے دی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ خلافت کمیٹی
سے کانگریس کے قبضے میں آئی اور کانگریس سے خدا جانے کس طرح مہاسبھا کے پاس پہنچ
بہرحال اب یہ مہاسبھا ہی کی تھی۔ بلکہ راشٹریہ سیوک سنگھ کا مرکز بھی تھا۔ میرے مکان سے
وہاں کا سارا شور سنائی دیتا تھا کہ ہندو کس طرح لڑائی کی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔
ان حالات کی روشنی میں مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ تقسیم کے وقت ہندو بہت بڑے پیمانے
پر کشت و خون کریں گے اور انگریز بھی یہی چاہتے تھے کہ جانے سے پہلے ہندو
مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر کشت و خون کرا دیا جائے۔ میں نے گورنمنٹ آف انڈیا
کے ایک ملازم سے کہا کہ آپ مجھے راشٹریہ سیوک سنگھ کا فائل کسی طرح فراہم کر
دیں تو شاید میں قائد اعظم سے چار منٹ مل سکوں اور بتا سکوں کہ ہندوؤں کے
عزائم کیا ہیں؟ ان صاحب کی ملازمت کے لئے یہ بڑے خطرے کی بات تھی لیکن میں
نے ان سے کہا کہ اگر آپ کے خطرہ مول لینے سے مسلمانوں کے قتل عام میں کمی ہو
سکتی ہے تو آپ کو یہ خطرہ ضرور مول لینا چاہئے۔ وہ ایک صاحب دل
مسلمان تھے۔ انہوں نے اپنی ملازمت کی پروا کئے بغیر ۱۹۴۷ء تک کا فائل مجھے
دیا جس سے ہندوؤں کے عزائم کا پتہ چلتا تھا۔ میں نے راتوں رات اس فائل کو
نقل کرایا پھر لے کر قائد اعظم کے پاس گیا اور ان کے سیکرٹری کے ذریعے

ان تک بھجوا دیا۔ بعد میں ایک دن قائد اعظم سے ملا کہ آپ نے اس فائل کو دیکھ لیا ہوگا
اور جو برا وقت آنے والا ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے آپ تیار ہوں گے۔ میں نے
محسوس کیا کہ قائد اعظم اس فائل کو پڑھ کر بہت متاثر ہوئے اور انگریز اور ہندو قوم
کے بارے میں ان کی سوچ میں تبدیلی آئی۔ لیکن حالات اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہے
تھے اور مسائل اتنے زیادہ ہو چکے تھے کہ اب اس جن کو قابو کرنا بہت مشکل تھا۔ انھوں نے
باتوں باتوں میں مجھے بتایا کہ وہ مسئلہ کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں اور ان حالات سے غافل
نہیں ہیں لیکن اب جو بھی صورت ہو مسلمانوں کو صبر و استقامت کے ساتھ اپنی منزل کی طرف
آگے بڑھنا چاہیے اور کوشش کرتے رہنا چاہیے کہ یہ صورت حال نہ پیدا ہو۔

قائد اعظم کی جن خوبیوں نے مسلمانوں کو ان کا گرویدہ بنایا، جن میں ان کی بصیرت
فراست، دیانت اور بے مثال شخصیت ممتاز تھیں۔ ان کے بارے میں یہ تاثر عام
تھا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس میں ان کا کوئی ذاتی مفاد نہیں۔ یہ درست ہے
کہ بعض اوقات ان کے بعض اقدامات ہماری سمجھ میں نہیں آتے تھے لیکن
قائد اعظم جو موقف اختیار کرتے تھے۔ اس کے پیچھے مضبوط دلائل ہوتے تھے۔
جو شخص کسی مسئلے پر ان کا ہم خیال نہ ہوتا اور بحث کرتا تو وہ دلائل کے ذریعے
اسے قائل کر لیتے تھے اور لوگ عموماً قائل ہو جاتے تھے۔

قائد اعظم مسائل پر غور و فکر اور ان کے تجزیے میں جذباتیت سے کام نہیں
لیتے تھے۔ ان کی ذہنی تربیت کچھ ایسی یا ان معاملات کا ادراک متعلقہ مسئلے کا ہر
پہلو سے ٹھنڈے دل سے جائزہ لینا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ نازک سے
نازک وقت میں بھی وہ توازن و استقلال کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں
دیتے تھے۔

قائد اعظم کی شخصیت میں شرافت اور خوش خلقی کا ایسا امتزاج تھا جو بہت
کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی بے لوثی تھی۔ خدا نے
انہیں بہت دولت و ثروت دی تھی۔ انھوں نے تہیہ کیا کہ کبھی اپنی ذات کے لئے

استعمال نہیں کیا۔ اور نہ کبھی اپنے مقصد کا سودا کیا۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ ان کو ہندوستان کا پہلا وزیر اعظم بنانے کی پیشکش بھی کی گئی لیکن وہ اپنے نصب العین سے ذرا بھر منحرف ہونے کو تیار نہیں ہوئے۔

میں ان لوگوں میں سے تھا جن کے دلوں میں پہلے سے قائد اعظم کے لئے بے پناہ عقیدت اور محبت جاگزیں تھی۔ میں پہلی مرتبہ ان سے انہی تصورات کے ساتھ ملا تھا لیکن بعد کی ملاقاتوں میں یہ نقوش اور زیادہ گہرے ہوتے گئے۔ ہم تمام لوگوں میں سے تھے جنہیں ان کے کارناموں کی وجہ سے پہلے ہی زیادہ عقیدت تھی لیکن جن لوگوں کو ان سے عقیدت نہیں تھی (یعنی ان کے نظریاتی مخالفین) ان پر بھی ان کی شخصیت کا بڑا گہرا اثر پڑتا تھا۔ مسلمانوں کے دلوں میں قائد اعظم پر جو بھرپور اعتماد پیدا ہوا اس کا سبب یہی احساس تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں واقعی ایسا ہی کرنا چاہتے ہیں اور اپنے قول میں مخلص ہیں۔

سید شمس الحسن

ملّی مفاد کے نگہبان

میرے والد نواب سید سید علی حسن مسلم لیگ کے بانی ممبروں میں تھے مجھے یاد
ہے کہ ۱۹۱۶ء میں جب لکھنؤ پیکٹ کے سلسلے میں کانگریس اور مسلم لیگ کا مشترکہ اجلاس
بارہ دری لکھنؤ میں ہوا تو وہ کمسنی کا زمانہ تھا اور میں والد صاحب کے ساتھ اجلاس میں
شریک ہوا تھا۔ وہاں میں نے پہلی بار قائد اعظم کو دیکھا اور ان کی تقریر سنی۔ میں نے
محسوس کیا کہ قائد اعظم میں ایک خاص قسم کی سنجیدگی ہے اور چہرے سے متانت اور
رعب ٹپکتا ہے کوئی انسان ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ لڑکپن
کے باوجود وہ نقوش آج تک میرے دل پر ثبت ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں جب لکھنؤ میں مسلم
لیگ کے سلسلے میں بہت بڑا اجلاس ہوا اور مسلم لیگ عوامی جماعت بن گئی۔
میں اس اجلاس میں بھی شریک تھا۔

قائد اعظم ماہر سیاست داں اور بلند انسان تھے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اپنی رائے
سے اختلاف ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہ ہر شخص کی رائے کا احترام کرتے اور
ہر ایک کا نقطہ نظر نہایت صبر اور تحمل سے سنتے تھے۔

قائد اعظم مولانا حسرت موہانی کے قدر داں تھے۔ مولانا حریت پسند اور با اصول
آدمی تھے۔ جس زمانے میں وائسرائے سے گفت و شنید ہو رہی تھی تو ایک تجویز ورکنگ
کمیٹی میں آئی کہ قائد اعظم کو فیصلہ کا کلی اختیار دے دیا جائے۔ حسرت موہانی واحد

شخص تھے جنھوں نے اختلاف کیا۔ انھوں نے کہا وہ یہ حق کسی کو دینے کے لئے تیار نہیں
اس کے باوجود قائداعظم کی اصول پرستی اور جمہوری کرداری دیکھیے کہ انھوں نے مولانا حسرت موہانی
کو لاہور اسٹیشن کے عام اجلاس میں اپنی مخالفت میں تقریر کرنے کی اجازت دی۔ پھر چونکہ
قائداعظم قواعد و ضوابط کے بہت پابند تھے مگر مولانا حسرت موہانی کی اس تجویز کی
مخالفت میں تقریر کے لئے کچھ کئی توڑنا شروع وقت کے باوجود قائداعظم نے انھیں نہ روکا۔ یہ
قائداعظم اختلاف کے باوجود حسرت موہانی کی عزت کرتے رہے اور مولانا بھی مسلم لیگ
کے وفادار رہے۔

مجھے یاد ہے کانپور میں قائداعظم کا استقبالیہ جلوس نکلا تو مسلمانوں نے پوری
سڑک پر قالین بچھائے۔ میں اس جلوس میں قائداعظم کے ساتھ تھا۔ وہ منظر آج تک
آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ جلوس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یو۔ پی کے مسلمان قائداعظم
کو کس قدر چاہتے اور ان سے کتنی عقیدت رکھتے تھے۔ یوں تو قائداعظم جہاں جاتے
ان کا شاندار استقبال کیا جاتا لیکن کانپور کا جلوس فقید المثال تھا۔

جمیعت علمائے ہند والا کانگریس میں شامل مسلمانوں کے سوا سبھی مسلمان مسلم
لیگ سے محبت کرتے تھے۔ علماء میں سب سے پہلے مولانا اشرف علی تھانوی ؒ نے
مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ ان کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی سب سے زیادہ اہم شخصیت تھے
انھوں نے مسلم لیگ کو دینی رجحان رکھنے والے مسلمانوں میں بالخصوص عوام میں تحریک کے
فروغ اور مقبولیت میں اہم کردار ادا کیا۔ میں نے جو سیاسی شعور اور دینی توازن ان
میں پایا وہ بہت کم علماء میں دیکھا گیا ہے۔ مجھے علم ہے کہ جب مولانا تھانوی ؒ
نے قائداعظم ؒ کی موافقت کی تو بعض علماء نے اعتراض کیا کہ آپ ایسے شخص کا ساتھ
دے رہے ہیں جس کا دین سے کوئی واسطہ نہیں۔ تو مولانا اشرف علی ؒ نے ایک
خط میں قائداعظم کو تین باتیں لکھی تھیں۔ ایک تو یہ کہ نماز پڑھا کریں دوسری کہ قرآن
پڑھنا سیکھیں اور تیسری کہ داڑھی رکھیں کیونکہ آپ تمام مسلمانوں کے قائد ہیں۔
قائداعظم نے تینوں کا ترتیب وار جواب دیا۔ جو یہ تھا کہ ۱۔ میں نماز پڑھوں گا
۲

مجلس ہلا ادیبوں کے ایک استاد رکھا ہے جس سے باقاعدہ قرآن پڑھنا سیکھیں اور روزہ کی کے متعلق دعا کیجیے۔ یوں تو بہت سے علمائے مسلم لیگ کی حمایت کی مگر مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے وابستگان، مولانا اشرف علی تھانوی اور پیر صاحب مانکی شریف کے وابستگان مسلم لیگ میں پیش پیش تھے۔

میرے نزدیک قائد اعظم کے کردار کی بڑی خصوصیت ان کی دیانت داری تھی۔ عالم یہ تھا کہ الہ آباد سیشن میں مسلم لیگ فنڈ کے لیے قائد اعظم نے اپیل کی تو ایک لڑکے نے ڈائس پر چندہ پیش کرنا چاہا تو قائد اعظم نے جواب دیا کہ "میں یہاں کوئی چندہ وصول کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ جن صاحب کو چندہ دینا ہو باقاعدہ متعلقہ آدمی کو دیں اور رسید حاصل کریں" سرحد کے اورنگ زیب خان نے کہا کہ اس بچے کی دل شکنی ہو گی۔ اسے اجازت دلا دیجیے کہ وہ ڈائس پر آ کر چندہ پیش کرے۔ مگر قائد اعظم نہ مانے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا بدترین دشمن بھی قائد اعظم پر قوم کے ایک پیسے کے ضیاع کا الزام عائد نہیں کر سکتا۔

اس واقعہ سے قائد اعظم کی اصول پرستی سے وفاداری اور ملی مفاد پر ذاتی مفاد کی قربانی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ قائد اعظم" وائسرائے کی اسمبلی کے رکن تھے۔ انھیں بجٹ اجلاس میں کسی اہم موضوع پر تقریر کرنا تھی۔ ایک شخص ان کے پاس مقدمہ لے کر آیا اور ایک لاکھ روپے بطور فیس پیش کیے۔ قائد اعظم نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ بجٹ اجلاس میں میری شرکت ضروری ہے اس لیے اس کیس کو نہیں لے سکتا۔

قائد اعظم بہت مردم شناس اور جہاں دیدہ تھے۔ وہ ہر شخص کی قابلیت، جبلت اور مزاج سے بہت جلد واقف ہو جاتے تھے۔ وہ اپنے کارکنوں کی قدر کرتے تھے۔ خواہ ان کی حیثیت کچھ بھی ہو۔ وہ امیر اور غریب میں امتیاز نہیں رکھتے تھے۔ ہر وہ شخص جو دیانت دار، محنت اور ایمانداری سے کام کرتا، اس کی عزت کرتے اور بہت بڑھاتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلم لیگ میں بعض ایسے اشخاص ان کے رفیق کار رہے۔

جن سے وہ بچ سکتے تھے۔ لیکن وہ کام لینا جانتے تھے۔ ان کا سلیقہ تھا کہ ایسے لوگوں سے بھی انھوں نے قتل کا کام لیا اور یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ان میں کیا خامیاں ہیں؟

مرتب کرنے میں مصروف ہو جاتا تھا۔ اور کچھ دیر بعد قائداعظم کے قدموں کی چاپ سے اندازہ
ہو جاتا تھا کہ وہ نیچے تشریف لے آئے ہیں۔ یاد رہے قائداعظم کی خواب گاہ پہلی منزل
پر تھی اور میرے نے ان کے نیچے تشریف لانے کے معنی یہ ہوتے تھے کہ اب پہلے خطوط کے جوابات
کے لیے قائداعظم کی طلبی کا انتظار کرنا چاہیے۔ لیکن یہ طلبی روزانہ کم ہی ہوتی تھی۔ مراسلات پر
قائداعظم کی توجہ ہفتے میں دو یا تین ہی بار ہوتی تھی لیکن اگر کوئی خط ایسا آ جاتا جس کا فوری
جواب ضروری ہو تو اس معمول میں تبدیلی ہو جاتی تھی۔ یہ تبدیلی صرف اسی خط کے لیے مخصوص
تھی جس کا جواب دیا جاتا ہو۔ باقی خطوط پر توجہ معمول کے مطابق ہی ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ
قائداعظم کا زیادہ وقت اخبارات پڑھنے میں صرف ہوتا تھا اور یہ کہنا بالکل درست ہے کہ وہ
اخبارات کو اتنے غور سے پڑھتے تھے کہ روزانہ کے واقعات ان کو تقریباً حفظ ہو جاتے تھے
ان کے پاس بہت سے اخبارات آتے تھے۔ کچھ تو ان میں سے خریدے جاتے تھے کچھ اعزازی
آتے تھے۔ جن میں بعض اخبارات وہ بھی ہوتے تھے جن میں قائداعظم کے خلاف زہر آلود مضامین
ہوتے تھے۔ قائداعظم ان کو بھی پڑھتے تھے اور اسی غور و خوض کے ساتھ جس طرح دوسرے
اخبارات کو۔

ان کی نظروں میں تین اخبارات ہمیشہ قابل احترام رہے۔ ایک بمبئی کا ٹائمز آف انڈیا،
دوسرے کلکتہ کا اسٹیٹسمین۔ تیسرے مدراس کا ہندو۔ پہلے دو اخبارات یعنی ٹائمز آف انڈیا
اور اسٹیٹسمین تو انگریزی حکومت کے ترجمان تھے چنانچہ وہ ہر سیاسی معاملہ کو حکومت ہند اور
حکومت برطانیہ کے نقطہ نگاہ سے دیکھتے اور جانچتے تھے۔ تیسرا اخبار "ہندو" کانگریس کا ترجمان
تھا جسے مسلم لیگ کی سیاست ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی لیکن ان تینوں اخباروں نے صحافت کے
اصولوں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ کسی معاملے میں بھی کبھی بے راہ روی اختیار نہیں کی اور جب بھی
مسلم سیاست پر اعتراض کرنے کی کوشش کی تو دلائل سے کام لیا۔ کلکتے کے اخبار اسٹیٹسمین
میں ایک مضمون ہر ہفتے شائع ہوتا تھا جسے الطاف حسین مرحوم لکھا کرتے تھے پہلے "شاہد" اور
بعد میں عین الملک کے قلمی نام سے۔ الطاف حسین اس زمانے میں بنگال کے محکمہ اطلاعات
کے رکن تھے اور مضمون کے لیے پیر اسٹیٹسمین میں لکھا کرتے تھے۔ اس مضمون کے لکھنے

کی خواہش پر موقر اخبار کے ایڈیٹر نے خود لکھی تھی۔ ٹائمز آف انڈیا میں ہر ہفتے مختلف سیاسی
نظریات پر ایک مقالہ شائع ہوتا تھا۔ یہ جائزہ ٹائمز آف انڈیا کے عملے کے ایک رکن کرنل
سراہی لکھا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کی مالی امداد چار ہفتے کے بعد بند ہو گئی تھی لیکن ایک مرتبہ
بھی یہ نہ ہوا کہ اس مقالے نے مسلم لیگ کی سیاست کی غلط ترجمانی کی ہو۔

"ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر سر فرانسس لو تھے۔ وہ مسلمانوں کی حمایت اور نقطہ نظر کی صحیح
ترجمانی کے حامی تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۴۲ء میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس بمبئی میں ہوا۔
اس میں ایک اہم مسئلہ پیش تھا۔ مسٹر راجے نے قومی دفاعی کونسل کی تشکیل کی تھی جس پر قائد اعظم
نے اعتراض کیا تھا کہ حکومت ہند کو اس بات کا حق نہیں تھا کہ وہ مسلم لیگ کے ہوتے ہوئے
مسلمانوں کے نمائندوں کو از خود نامزد کرے۔ یہ اجلاس اچھا خاصا ہنگامہ خیز تھا اور اس
میں مختلف زاویہ نظر پیش ہوئے تھے۔ اس اجلاس کی رپورٹنگ کے لئے ٹائمز آف انڈیا
کے نمائندے عبدالشکور جعفری مقرر ہوئے تھے۔ اجلاس کے پہلے روز جو اطلاعات اور
خبریں ان کو ملیں ان کے بیان کی بنا پر انہوں نے ایک خبر مرتب کر دی جو ٹائمز آف انڈیا میں
شائع ہو گئی لیکن چونکہ واقعات صحیح نہیں تھے اس لئے خبر بھی غلط تھی۔ دوسرے روز مسلم
لیگ کی طرف سے احتجاج کیا گیا۔ قائد اعظم نے سر فرانسس لو کو ٹیلیفون کیا اور نتیجے میں
عبدالشکور جعفری کو معطل کر دیا گیا اور بعد میں قائد اعظم ہی کی خواہش سے جعفری بحال
کئے گئے۔

۱۹۴۱ء میں مسلم لیگ کا اجلاس مدراس میں ہوا۔ قائد اعظم نے بیماری کی وجہ
سے کرسی پر سے خطاب کیا اور تقریباً دو گھنٹے تقریر کی۔ "ہندو" کے نمائندے بھی وہاں
موجود تھے۔ انہوں نے تقریر کو شارٹ ہینڈ میں لکھ لیا۔ دو تین گھنٹے کے اندر یہ تقریر ٹائپ
ہو کر قائد اعظم کے پاس پہنچائی گئی اور ان سے درخواست کی گئی کہ صفحات کی جانچ کے
پیش نظر وہ "ہندو" اخبار سے تعاون کریں اور اگر کہیں غلطی رہ گئی ہو تو اس کی تصحیح
کر دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات قائد اعظم کو بہت پسند آئی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس
ٹائپ شدہ تقریر میں تبدیلی، اضافے یا رد و بدل کی کوئی خاص ضرورت پیش

نہیں آتی۔

ڈاک سے آئے ہوئے خطوط قائداعظم خود کھول لیتے تھے۔ وہ اس وجہ سے خط و کتابت کریں۔ میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ ممکن ہے کہ میری غفلت سے کبھی کوئی خط ادھر ادھر ہو جائے تو یہ بہتر ہوگا کہ میں نے قصداً کوئی خط ادھر ادھر کر دیا اور قائداعظم تک نہیں پہنچنے دیا۔ اس احتیاط کے باوجود لوگوں نے اپنا یہ بے بنیاد الزام لگایا کہ قائداعظم آپ کا جواب ضرور دیتے لیکن ان کے سیکرٹری نے خط دبا لیا ہوگا۔ اس لیے جواب سے محروم رہا۔ انگریزی میں لکھے خطوط تو قائداعظم خود پڑھتے اور اردو کے خطوط سن کر سمجھتے تھے۔ اور اگر کوئی اردو میں لکھا ہوا خط کسی اہم بات یا مسئلہ سے تعلق رکھتا تھا تو پھر اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے ان کے سامنے رکھ دیا جاتا تھا۔ خطوط کے جوابات صرف انگریزی ہی میں دیے جاتے تھے۔ پچیس تیس سے لے کر پچاس خط روزانہ وصول ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض تو دوسرے قائدین کی طرف سے جماعتی یا مرکزی سیاسی معاملات کے متعلق ہوتے تھے کچھ عام لوگوں کی طرف سے ذاتی درخواستیں، کچھ عجیب و غریب قسم کے مطالبات اور کچھ بالکل بے کار بلکہ مضحکہ خیز۔ اس کے علاوہ کانفرنسوں کے دعوت نامے۔ طالب علموں کی طرف سے پیغامات کی درخواست۔ ملاقات کے لیے وقت کے تعین کی درخواست، اخبارات کے تراشے اور ان پر تبصرے، مسلم لیگیوں کی شکایات، غرضیکہ جس کی سمجھ میں جو چیز آتی اس نے لکھ کر بھیج دیا۔ جہاں مدح سرائی ہوتی تھی وہاں نکتہ چینی اور برا بھلا بھی ہوتا۔ جہاں حکم کی تعمیل کا وعدہ ہوتا وہاں آئندہ کے لیے نصیحت بھی۔ حالانکہ یہ سب کو معلوم تھا کہ سیاسی معاملات میں قائداعظم کو نصیحت کرنا سورج کو چراغ دکھانا تھا۔ لیکن پھر بھی لکھنے والے بے دھڑک لکھ جاتے تھے۔ کچھ نصیحتیں بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ مثلاً ایک صاحب نے لکھا کہ آپ کی قیادت کے تو ہم سب قائل ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ آپ سے کوئی غلطی سرزد نہ ہو جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے۔ مگر میری رائے ہے کہ آپ داڑھی رکھ لیں۔ ایسا کرنے سے مسلمان بھی خوش ہو جائیں گے اور خدا تعالیٰ بھی۔ اس طرح فضل الٰہی کی برکت سے غلط کام کا امکان ختم ہو جائے گا۔" ایک اور صاحب نے

کہا: "اگر آپ ہاتھ کا کتا ہوا اور ہاتھ کا بنا ہوا کھدر اپنی پوشاک کے لیے استعمال کریں تو آپ کو عوام میں مزید مقبولیت حاصل ہو جائے گی۔"

چونکہ اس قسم کے خطوط اکثر اردو میں ہوتے تھے اس لیے میں ان کو پڑھ پڑھ کر سنایا کرتا تھا اس لیے وہ مجھ سے پوچھا کرتے تھے کہ میری اس معاملے میں کیا رائے ہو سکتی ہے اور شاید اس لیے بھی کہ میں توجہ ان کی رائے کی طرف مبذول کرا سکوں لیکن میں کیا رائے دیتا میں چپ رہتا اور کوئی جواب نہ دیتا۔ پھر وہ خود کہتے "اگر عوام میں مقبولیت ڈھونگ رچا کر ہی حاصل کی جاتی ہے تو لعنت ہے ایسی مقبولیت پر" اور یہ حقیقت ہے کہ لوگ چاہے کچھ بھی کہیں عوام کو تو قائد اعظم کی خوش پوشی، وضع داری، بانکپن، خودداری اور بے نیازی بے حد سے زیادہ عزیز تھی۔ اس لیے کہ ان کی دیانت داری اور خلوص میں کسی کو بھی شبہ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ان کے دشمنوں کو بھی نہیں۔

کراچی سے ایک خط آیا جو شکار پور کے اطراف کے فقیروں کی طرف سے لکھا ہوا تھا۔ خط کیا تھا ایک درخواست تھی جس میں کہا گیا تھا کہ سر غلام حسین ہدایت اللہ کی حکومت نے چرس پر پابندی لگا دی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہمیں گانجا پینا پڑتا ہے اور یہ ہمارے لیے زیادتی ہے کہ ہم کو قانوناً مجبور کیا جائے کہ ہم ایسا نشہ کریں جو ہمارے شایان شان نہیں۔ چنانچہ آپ سر ہدایت اللہ کو تنبیہ کریں کہ وہ اپنے سیاسی اقتدار کا غلط استعمال نہ کریں اور چرس کی فروخت کو بلا تاخیر بحال کر دیں۔ یہ بھی اسی عقیدت کا ہی مظاہرہ تھا جو ہر طبقے کے لوگوں کو قائد اعظم کی ذات سے تھی اور جو یہ سمجھتے تھے کہ قائد اعظم ہر ایک کے حق کے لیے لڑتے ہیں۔

میسور کے نندی پہاڑ پر قائد اعظم نے کچھ روز قیام کیا۔ وہاں ایک خط موصول ہوا جو مدراس سے آیا تھا۔ خط اردو میں تھا اور لکھنے والے نے بدل بدل کر لفظ استعمال کیا تھا جو غالباً کسی مجبوری سے پھاڑا گیا تھا۔ یہ خط ایک تلنگے والے نے لکھا تھا۔ خط گالیوں سے شروع ہوتا تھا لیکن بعد میں لکھنے والے نے لکھا تھا کہ ہماری گالیوں کا برا نہ مانیں کیونکہ ہم تلنگے والوں کی زبان ہی ایسی ہوتی ہے۔ ماں کی یہ زبان ہمارے پیار کی زبان ہے۔ یہ

خط دو قسطوں میں موصول ہوا تھا۔ پہلی قسط میں اس نے لکھا تھا کہ میرے پاس ایک کاپی
آئی ہے، اس لیے باقی خط پھر لکھوں گا۔ چنانچہ دوسری قسط دوسرے روز مل گئی۔ اس خط
کا لب لباب یہ تھا کہ راقم الحروف کا سب سے بڑا شکوہ قائد اعظم سے یہ تھا کہ قائد نے
مسلمانوں کی قیادت کی دوسری پیڑھی کا تعین نہیں کیا۔ اس نے لکھا تھا کہ قائد اعظم
تمہاری وفات کے بعد مسلمانوں میں ایک خلا پیدا ہو جائے گا جس کی وجہ سے مسلمانوں کو سیاست
کے شکنجے میں پھنس جانے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے اپنے پیچھے کی قیادت کو ابھی سے منظم کرنا
شروع کر دو۔ قائد اعظم نے حسب دستور مجھے کہا کہ میں یہ خط پڑھ کر سناؤں لیکن میں نے
خط کی آغاز سے پڑھ کر سنانے سے انکار کر دیا۔ اور عرض کیا کہ اس میں گستاخیاں لکھی ہوئی
ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ کوئی بات نہیں اس کو پڑھو۔ جب میں نے نہ پڑھنے پر اصرار کیا تو وہ
بہت خفا ہوئے اور مجھے جھڑک کر کہا کہ تم کو پڑھنا پڑے گا۔ قائد اعظم کے اس رویہ
سے مجھے سخت صدمہ ہوا اور میں رو ہانسا ہو گیا۔ لیکن انھوں نے دوبارہ کہا کہ تمہیں خط
پڑھنا ہوگا۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ جس ماحول میں میری نشوونما ہوئی ہے۔ اس
نے میری زبان پر ایسی پابندی لگا دی ہے کہ ایسے الفاظ ادا کرنے کے لیے میری زبان
کا پلٹنا مشکل ہے۔ اس پر وہ ذرا نرم ہوئے اور کہا کہ اچھا چھوڑ چھوڑ کر پڑھو۔ اس
طرح وہ خط میں نے انھیں سنایا لیکن جب میں اس حصے پر پہنچا جہاں اس نے قیادت
کی دوسری پیڑھی کا ذکر کیا تھا تو انھوں نے کہا کہ دیکھو یہ خط معمولی نہیں ہے۔ اس تانگے
والے نے بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے۔ اس خط کا مجھے جواب ضرور جانا چاہیے
لیکن تانگے والے نے اپنا پتا نہیں لکھا تھا۔ اس کا انھیں بے حد رنج ہوا۔
پھر مجھ سے کہا اس خط کا انگریزی میں ترجمہ کر کے مجھے دو۔

دوسرے روز انھوں نے اس خط کو پھر نکالا اور مجھ سے کہا کہ سیاست
میں مختلف مزاج کی ضرورت ہے۔ سیاست میں رہ کر نہ تعریف کا اثر لینا چاہیے نہ
گالیوں سے رنجیدہ ہونا چاہیے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اپنا ضمیر صاف
رکھو۔ انھوں نے کہا مجھے یہ حق پہنچتا ہے کہ مسلمانوں کی آئندہ قیادت کے لیے افراد کو

منتخب کروں۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمان اپنی قیادت کے لیے خود ہی کسی کو منتخب کر
لیں گے اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔ مسلمانوں کی سیاست میں میری حیثیت تو نہیں ہے کہ
میں اپنا جانشین مقرر کروں۔

لاہور کی قرارداد کو منظور ہوئے چند ہی مہینے گزرے ہوں گے کہ چین کے مسلمانوں
کی طرف سے ایک وفد قائداعظم سے ملنے آیا۔ اس کے سربراہ مسٹر عثمان وو تھے۔ وہ
اپنے ساتھ ایک خط لائے تھے اور اس کے ساتھ ایک خاصا لمبا ریشمی کپڑا لائے جس
پر نہایت چمکدار ریشمی دھاگوں سے ایک عقاب کڑھا ہوا تھا جو اتنا خوبصورت
تھا کہ اس پر سے آنکھ ہٹانا مشکل ہوتا۔ عقاب کے ایک ایک پر کی رگیں اور یہاں
تک کہ اس کی آنکھوں کی پتلیوں کی دھاریاں اتنے قدرتی انداز میں کاڑھی گئی تھیں کہ
اگر اسے دور سے دیکھا جائے تو یہ تمیز کرنا مشکل ہوتا کہ آیا یہ محض کشیدہ کاری کا نمونہ
ہے یا واقعی ایک عقاب بیٹھا ہے۔ اسی طرح اس شاخ کی چھال جس پر وہ بیٹھا ہوا
دکھایا گیا تھا اتنی چابکدستی سے بنائی گئی تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کچھ جھلسی ہوئی پپڑیاں
اب گرنے والی ہیں۔ خط چینی زبان میں لکھا گیا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کا انگریزی
ترجمہ منسلک تھا۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ ہم چینی مسلمان آپ لوگوں کی یعنی اپنے مسلمان
بھائیوں کی جدوجہد کا اتنی ہی تیز نظری اور غور سے دیکھ رہے ہیں جس طرح عقاب
ہر چیز کو دور سے دیکھتا ہے۔ ہم کو یقین ہے کہ ہماری اس نگرانی سے سب
کو تقویت پہنچے گی۔

وفد آیا اور ملاقات کر کے چلا گیا لیکن اس تحریر کا جواب بھی دیا جانا تھا۔
قائداعظم نے مجھے کہا کہ ایک مختصر سا جواب لکھ دو لیکن یہ نہیں بتایا کہ ان کے
تاثرات کیا تھے۔ آیا یہ وفد رسمی تھا یا واقعی اس کے پیچھے کچھ جذبات کام کر رہے
تھے۔ چنانچہ میں نے لکھ دیا کہ آپ نے تحفہ بھیجا۔ میں بہت مشکور ہوں اور مجھے
یقین ہے کہ یہاں کے مسلمان بھی آپ کی ہمدردی اور محبت کے شکر گزار ہوں گے۔
میں نے جب یہ خط قائداعظم کے سامنے دستخطوں کے لیے پیش کیا گیا تو انھوں نے کہا

کسی کی ورزش کا جواب اتنی سرد مہری سے تو نہیں دینا چاہیے۔ اس جواب میں کچھ تو گرم جوشی سے کام لو۔ چنانچہ میں نے اس خط کا مضمون بدل دیا۔ اور دوبارہ ان کے سامنے پیش کیا جس کو انہوں نے پسند کیا اور دستخط کر دیے۔

ایک بچے کا خط

حیدرآباد دکن سے ایک بچے نے خط بھیجا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس کی عمر نو سال ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اپنی زندگی قوم کی خدمت میں صرف کرے اور قائد اعظم کی خدمت میں درخواست کی تھی کہ وہ اس کو مسلم لیگ کا ممبر بنا لیں اور ساتھ ہی اس کو ہدایت دیتے رہیں کہ اس کو کیا کرنا چاہیے۔ اس خط کا جواب قائد اعظم نے مجھے اس طرح لکھوایا: "جناب عالی! آپ کا خط موصول ہوا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلم لیگ کے آئین کے مطابق کوئی شخص رکنیت حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ سن بلوغت کو نہ پہنچ چکا ہو۔ آپ کی عمر نو سال ہے لہٰذا آپ مسلم لیگ کے ممبر نہیں ہو سکتے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی آپ کو معلوم ہونی چاہیے کہ آپ ایک ریاست کے باشندے ہیں اور مسلم لیگ ریاست کے باشندوں کو ممبر نہیں بناتی۔ چنانچہ میں مجبور ہوں کہ آپ کی درخواست کو نامنظور کروں۔" جب میں یہ جواب ٹائپ کرنے بیٹھا تو میں نے سوچا کہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ اس بچے نے نہ معلوم کن جذبات میں ڈوب کر یہ خط لکھا ہوگا اور یہ جواب اس کی ساری امنگوں پر پانی پھیر دے گا۔ چنانچہ اس کی جگہ میں نے اپنی طرف سے ایک مضمون بنایا اور اس میں اس بات کا خیال رکھا کہ گویا یہ خط ایک بزرگ کی طرف سے اپنے ایک خورد کو لکھا جا رہا ہے۔ خط میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ابھی تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم اپنی تعلیم مکمل کرو۔ سیاست میں حصہ لینے کا وقت بھی آئے گا لیکن ابھی اس کی کوئی جلدی نہیں۔ اپنے والدین کی اطاعت کرو اور ان سے مشورہ لیتے رہو کیونکہ وہی تمہارے سچے بہی خواہ ہیں۔ جب یہ خط قائد اعظم کے سامنے پیش ہوا تو وہ فوراً سمجھ گئے۔ مجھ سے کہا کہ یہ وہ مضمون تو نہیں ہے جو میں نے لکھوایا تھا مگر یہ خط اس سے بہتر ہے اور فوراً دستخط کر دیے۔ کتنا غلط ہے یہ خیال کہ قائد اعظم میں انسانی جذبات نہیں تھے اور کتنا غلط

ہے یہ خیال کرتا کہ قائداعظم کسی کی بات نہیں سنتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب قائداعظم کے
پاس ایسے خطوط آتے کہ جن کا نہ سر ہو نہ پیر تو وہ یا تو ہنسنے لگتے تھے یا کہتے تھے کہ اس
شخص کے دماغ میں شاید خلل ہے۔ پھر ایسے ہدایت کرتے تھے کہ جواب میں لکھو
کہ میں اس معاملے میں کوئی مدد نہیں کر سکتا اور کبھی ایسا بھی کہتے تھے کہ بھائی میرے
پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ میں بذاتِ خود لوگوں کے معاملات میں دخل دوں یا اس کی
چھان بین کروں۔ لیکن اگر کوئی انفرادی معاملہ کسی اصول کی نشاندہی
کرتا ہوا نظر آتا تو اس کی پیروی میں دریغ نہیں کرتے تھے۔ پچھلی جنگ میں
پروفیسر عبدالستار خیری کو حکومت ہند نے گرفتار کر لیا تھا۔ نوابزادہ لیاقت علی خان
نے قائداعظم کی توجہ اس کی طرف مبذول کرائی تو انہوں نے یو پی کے گورنر کو خط لکھا
اور اس کا جو جواب ان کو ملا وہ نوابزادہ کو انہوں نے لکھ بھیجا۔

مہاراجہ محمود آباد کے والد مرحوم قائداعظم کے بڑے گہرے دوست تھے اور ان کو قائداعظم
سے اتنی عقیدت تھی کہ انہوں نے اپنی وصیت میں قائداعظم کو اپنی ریاست اور اپنے بچوں
کا سرپرست مقرر کیا تھا چنانچہ راجہ صاحب محمود آباد اور ان کے بھائی مہاراج کمار محمود آباد
قائداعظم کو چچا اور مس فاطمہ جناح کو پھوپھی صاحبہ کہتے تھے اور قائداعظم بھی انگریزی
طریقے کے مطابق اپنے خطوط کا اختتام Youra affectionately
یعنی تمہاری محبت میں سرشار کے الفاظ پر کیا کرتے تھے۔ چاہے وہ خط ذاتی ہوں یا
کسی سیاسی مسئلے کے متعلق ہوں۔ چنانچہ اپریل ۱۹۴۲ء میں قائداعظم نے ایک خط کے
جواب میں راجہ صاحب محمود آباد کے چھوٹے بھائی مہاراج کمار امیر حیدر خان کو ایک خط
لکھا جس سے قائداعظم کے دلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور اس بات کی نشاندہی بھی
ہوتی ہے کہ اصول کے معاملے میں وہ بھائی بھتیجے کسی کو کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے
لکھا کہ تمہارا خط موصول ہوا مگر مجھے افسوس ہے کہ تم اس طرح مصروف عمل ہو کہ جس سے
شیعوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ میں نے شیعہ کانفرنس کے لیڈروں سے بات چیت
کی ابتدا سے ہی گفتگو کی۔ اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں کر سکتا۔ میں اب بھی اسی
خیال کا حامی ہوں کہ پہلے تم اور دوسرے معزز اور ذی اثر شیعہ حضرات مسلم لیگ میں شمولیت

اختیار کریں۔ اس کے بعد انصاف اور اعتدال سے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ مجھے تو کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی کہ خواہ مخواہ شیعوں کی نمائندگی الیکشن اور حکومت کے مختلف شعبوں سے محروم رکھا جائے۔ اور پھر مسلم لیگ کی تنظیم اس طرح کرنی چاہیے کہ مسلمانوں کے ہر فرقے کو انصاف مل سکے۔ جہاں تک شیعوں کے مذہبی عقائد اور نظریات کا تعلق ہے یہ تو ایک صریحاً سی بات ہے کہ اگر مسلم لیگ کی کوئی وقعت ہے تو وہ اس کو مدنظر رکھے گی کہ اس کی کوئی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔ مجھے تمہارے اس جملے سے تعجب ہوا کہ شیعہ حقوق کے تحفظ کے لیے صوبائی گورنروں اور گورنر جنرل کو خصوصی اختیارات سونپے جائیں تاکہ بوقت ضرورت وہ ان اختیارات کو استعمال کر سکیں۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ حکومت برطانیہ کے اختیارات تیزی سے کم ہوتے جا رہے ہیں اور پچھلے ڈھائی برس کے عرصے میں کیا تم کو اس بات کا اندازہ نہیں ہوا کہ گورنروں اور گورنر جنرل کے خصوصی اختیارات کی کوئی وقعت نہیں رہی اور کیا تم کو اس بات کا خیال نہیں کہ حکومت برطانیہ کے حالات میں یہ بات صاف ظاہر ہے کہ برطانیہ کی حکومت ختم ہونے والی ہے۔"

انھوں نے لکھا کہ "میں پھر اس بات کا پُرزور اعادہ کروں گا کہ شیعہ حضرات کو مسلم لیگ میں شامل ہو جانا چاہیے۔ فرقوں کا تحفظ اپنی جگہ ہے لیکن ہم کو یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ ہم سب مسلمان ہیں۔"

بہت سے لیڈر ایک دوسرے کی شکایات بھی لکھتے تھے۔ لیکن قائداعظم کا جواب صلح جویانہ ہوتا تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ چودھری خلیق الزماں صاحب نے پنجاب کے لیڈروں کے خلاف قائداعظم کی توجہ مبذول کرائی۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ "میں بہت مشکور ہوں ان اطلاعات کے لیے جو آپ نے پنجاب کے لیڈروں کے متعلق میرے سامنے پیش کیے۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی میٹنگ عنقریب ہونے والی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس میں شرکت کریں گے۔ اس موقع پر میں بعض ایسے واقعات سے آپ کو آگاہ کروں گا جن کا آپ کو پورا پورا علم نہیں ہے۔"

اگر کسی مسلمانوں کی صوبائی یا ضلعی سطح کی سیاست میں تعطل پیدا ہو جاتا تو قائد اعظم اس کو مرکزی سطح پر لانے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے ملک برکت علی کو لکھا کہ "سوال یہ نہیں کہ ایک پارٹی ختم ہو یا دوسری، ایک فریق ہارے یا دوسرا، ایک ہارے یا کوئی اور، ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ مسلمانوں کے مفاد میں کون سی چیز بہتر ہے اور آپ کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے۔"

قائد اعظم کی قیادت میں مسلم لیگ نے اس بات پر زور دیا کہ وہ مسلمانوں کی ایک واحد نمائندہ جماعت ہے اور آخر کار وہ کامیاب ہو گئے لیکن پھر بھی کانگریس کسی نہ کسی مسلمان کو اکسا کر آگے کر دیتی تھی۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ کانگریس صرف ایک سیاسی جماعت ہے اور ہندوؤں کی جماعت نہیں ہے۔ قائد اعظم کا استدلال اس سلسلے میں اس طرح ہوتا تھا کہ مسئلہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان نہیں بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہے لہٰذا اگر کوئی مفاہمت کی راہ نکل سکتی ہے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیڈروں کے درمیان گفتگو سے ہی نکل سکتی ہے۔

چنانچہ جب مولانا ابوالکلام آزاد کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور انہوں نے قائد اعظم سے ملنے کی خواہش کا ایک تار بھیجا تو اس کے جواب میں قائد اعظم نے کہا کہ آپ نہ تو مسلمانوں کے نمائندے ہیں اور نہ ہندوؤں کے۔ آپ کی وجہ سے مسلمانوں کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ آپ کی حیثیت کانگریس کے شو بوائے یعنی نمائشی صدر جیسی ہے۔ آپ کو چاہیے کہ اس کردار کو ترک کر دیں۔ یہ جواب بہت سے لوگوں نے ناپسند کیا۔ اس لیے کہ ان کے خیال میں یہ بہت سخت تھا لیکن اس جواب سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مسئلہ کانگریس اور مسلم لیگ کا نہیں بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تھا۔

لاہور کی قرارداد منظور ہونے کے بعد قائد اعظم نے مسلمانوں سے چندے کی درخواست کی اور کہا کہ یہ چندہ ان کو براہ راست بھیجا جائے۔ چنانچہ سینکڑوں کی تعداد میں روزانہ منی آرڈر آتے تھے۔ ان کی رسید پر دستخط کرنا ہوتا تھا۔ انہوں نے

مجھے کہا کہ وصول کر لیا کرو۔ میں نے اس کے جواب میں ان سے عرض کیا کہ یہ لوگ منی آرڈر
شاید اس وجہ سے بھیجتے ہیں کہ اس بہانے آپ کے خطوط ان کے پاس محفوظ ہو جاتے ہیں
چنانچہ انہوں نے رسیدوں پر دستخط کرنا منظور کر لیا۔ اکثر اوقات منی آرڈر اتنی تعداد میں
جمع ہو جاتے کہ ان کی گڈیوں میں مدد ہونے لگتا تھا۔ اس کے بعد وہ منی آرڈر پر لکھے
ہوئے پیغامات کا مطالعہ کرتے تھے۔ اور جو منی آرڈر بچوں کی طرف سے آتے تھے۔
ان کا جواب بھی لکھتے تھے۔ مثلاً اگر بچے لکھتے تھے کہ میری ماں مجھے خرچ کے لیے
ایک آنہ روزانہ دیتی ہے۔ میں نے ایک ہفتے تک کچھ خرچ نہیں کیا اور اس سے جو رقم
جمع ہوئی وہ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ تاکہ پاکستان کے بننے میں میرا حصہ بھی شامل ہو
سکے۔ قائداعظم ایسے خطوط کا جواب ضرور دیتے تھے اور مضمون کچھ اس طرح ہوتا تھا کہ
میرے لیے یہ چھوٹی سی رقم لاکھوں روپے سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس لیے کہ یہ خلوص
دل سے پیش کی گئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ جب تم اپنی تعلیم مکمل کر لو گے تو تم کو مسلمانوں
کی خدمت کے لیے موقع ملے گا اور تم انہی جذبات سے اس کو انجام دو گے۔ مجھے
تمہارے جذبات کا بہت احترام ہے۔

سید حسین امام

حق گو اور بے باک قائد

جہاں تک قائد اعظم کے رفیق کار ہونے کا تعلق ہے مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کہ میں حقیقی معنوں میں ان کا رفیق کار نہیں تھا۔ ان کے رفقا میں تو صرف علامہ اقبال، مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خان جیسے لوگ تھے جو اب اس دنیا میں نہیں۔ ان کے بعد بعض لوگوں کو قائد اعظم کی قربت اور مشاورت کا شرف حاصل ہوا جن میں اکثریت مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اراکان کی تھی، جن میں میرا شمار بھی ہوتا ہے۔

قائد اعظم سے میری ملاقاتوں اور واقفیت کا سلسلہ طویل عرصے تک جاری رہا۔ مجھے ان سے پہلی ملاقات کا شرف اس وقت حاصل ہوا جب میں لندن میں زیر تعلیم تھا۔ میں ۱۹۲۰ء میں لندن گیا۔ اس زمانے میں ہندوستانی طلبہ کو حکومت برطانیہ سے کچھ شکایات تھیں۔ چنانچہ ایک انجمن تشکیل دی گئی جس کی درخواست پر مسٹر جناح اور مسز سروجنی نائیڈو نے جو ان دنوں لندن میں تھے ہماری بہت سی مشکلات حل کرا دیں۔ ان طلبہ نے ــــ جن میں ہندو مسلمان سبھی تھے کیکسٹن ہال میں ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ ترتیب دیا۔ سب اس بات پر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے کہ ہندوستان کے دو عظیم رہنما ان کے درمیان موجود تھے۔ منتظمین نے انہیں پورے ہال میں گھمایا اور اس طرح ہمیں ان سے متعارف ہونے کا موقع مل گیا۔ میں ۱۹۲۱ء میں وطن واپس آ گیا۔

۱۹۱۶ء کے لکھنؤ پیکٹ کے بعد برصغیر کے دوسرے مسلمان نوجوانوں کی طرح میں نے بھی

سیاست میں باقاعدہ دلچسپی لینی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۸ء میں کلکتہ میں جب آل پارٹیز کانفرنس شروع ہوئی تو میں بھی اس میں شریک ہوا۔

۱۹۳۱ء میں الہ آباد میں آل پارٹیز کانفرنس ہوئی وہاں مجھے ایک بار پھر قائداعظم کی تقریر سننے کا شرف حاصل ہوا۔ اسی دوران ان سے تفصیلی بات چیت کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ ہوا یہ کہ جسٹس محمد سلیمان نے قائداعظم اور دیگر چند مسلمانوں کو مدعو کیا۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ اس موقع پر قائداعظم نے یہ بتایا کہ لندن میں گول میز کانفرنس ہونے والی ہے جس میں سر آغا خان مسلمانوں کے وفد کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ آپ اختلافات کو نظر انداز کر کے آغا خان کے ساتھ بیٹھیں اور ان کے ساتھ تعاون کریں۔

اس کے بعد قائداعظم لندن چلے گئے اور کئی برس وہیں مقیم رہے۔ چنانچہ ان سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ ہندوستان واپس آکر بمبئی کے شہری حلقے سے ممبر مرکزی اسمبلی منتخب ہوئے۔ یہ انہی کا اعزاز تھا کہ ان کا نام سر رحمت اللہ چنائے نے تجویز کیا جو اس وقت اسی حلقے سے رکن تھے۔

۱۹۳۶ء میں بمبئی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں قائداعظم کی موجودگی میں میں نے تقریر کی۔ اس جلسہ میں سر محمد یعقوب نے مسلم لیگ کے اعزازی سیکرٹری کے عہدے سے استعفا پیش کیا اور ان کی جگہ نواب زادہ لیاقت علی خان پہلی بار مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ اس اجلاس میں قائداعظم نے مسلمانوں کو آنے والے انتخابات میں متحد رہنے اور مسلم لیگ کو ہر حال میں کامیاب بنانے کی اہمیت پر زور دیا۔

۱۹۳۷ء میں لکھنؤ کے مسلم لیگ کونسل اجلاس میں بھی میں شریک تھا۔ قائداعظم نے پنجاب سکندر پیکٹ کی وضاحت کی۔ اس کے بعد مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں قائداعظم نے مذکورہ پیکٹ کے متعلق لوگوں کی یہ غلط فہمی دور کی کہ مسلم لیگ نے سر سکندر حیات کے دباؤ میں آکر صلح کی ہے۔ قائداعظم کی اس تقریر نے لوگوں کو بہت متاثر کیا۔ اسی اجلاس میں قائداعظم نے مسلم لیگ کو عوامی[12] جماعت بنایا۔ سالانہ چندہ ۵ روپے کے بجائے دو آنے ہو گیا۔

اب میں چند ایسے واقعات کا ذکر کروں گا جن سے قائداعظم کی شخصیت کے اہم پہلو اجاگر ہوتے ہیں اور جو میرے ذہن پر اب تک نقش ہیں۔ ایک مرتبہ میں اپنے ایک وکیل عزیز کو قائداعظم کی خدمت میں لے گیا۔ وہ ان دنوں دہلی میں دس اورنگ زیب روڈ پر رہتے تھے۔ مقصد تھا سرکاری ملازمت کے لئے قائداعظم کی سفارش حاصل کرنا۔ جواب میں قائداعظم نے مجھے غور سے دیکھا۔ گویا انہیں میری بات پر بڑی حیرت ہوئی۔ پھر توقف کے بعد فرمایا "اول تو میں سفارش کا قائل نہیں۔ اس لئے کہ پھر اس شخص کی کارکردگی کی تمام ذمہ داری مجھ پر آپڑتی ہے جس کا حل مجھ سے ممکن نہیں۔ میرے پاس صرف یہی تو ہے کہ میں حکومت کی مذمت کرتا ہوں اور اگر اس کے عوض میں حکومت کی مخالفت کرنا بند کر دوں تو یہ ممکن نہیں کیونکہ یہ قوم سے غداری ہوگی۔ اس کے معانی یہ ہوئے کہ حکومت سے ایک سفارش کر کے میں نے قوم کو فروخت کر دیا۔ کیا تمہیں اسلام کی یہ بات پسند ہے؟" میں گھبرا گیا۔ میری گھبراہٹ کو دیکھتے ہوئے قائداعظم نے انتہائی ہمدردی سے پھر فرمایا۔ "دوسری بات یہ کہ کسی شخص کی سفارش کرنا اسے ذاتی طور پر اپاہج کرنے کے مترادف ہے۔ پھر وہ شخص ذاتی کوشش کی بجائے قدم قدم پر دوسروں کے سہارے ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اس لئے میں ملازمت کی سفارش کرنے کی بجائے انہیں وکالت کے پیشہ ہی میں رہنے کی رائے دوں گا۔"

میں ہندوستان کی سینٹ یعنی کونسل آف اسٹیٹ کے اجلاس سے فرصت پاکر کبھی عام طور پر اسمبلی کی گیلری میں جا بیٹھتا تھا جب قائداعظم تقریر کرتے یا میری اپنی دلچسپی کا کوئی مسئلہ زیر بحث ہوتا میں غور سے سنتا ورنہ میں اکثر وقت اسمبلی کی لابی میں دوسرے اراکین کے ساتھ تبادلہ خیالات میں صرف کرتا۔ ایک روز لابی میں قائداعظم سے ملاقات ہوئی میں نے عرض کیا "یہ خبر گرم ہے کہ آپ دو چار دن کے لئے دہلی سے باہر تشریف لے جا رہے ہیں" فرمایا "ارادہ تو تھا مگر اب نہیں جاؤں گا۔" میں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا "وکالت کے سلسلہ میں میرا یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی موکل آتا ہے تو میں اس سے یہی کہتا ہوں کہ میری دو دن کی فیس اور اپنے کاغذات میرے دفتر میں جمع کرا دو پھر مقدمہ کی

تاریخ سے چند روز قبل میرے پاس آئے۔ چنانچہ ایک موکل نے ایسا ہی کیا مگر جب میں نے
اس کے کاغذات پڑھے تو معلوم ہوا کہ میرے موکل کا کیس بہت کمزور ہے اور وہ حق پر
نہیں ہے۔ اس لئے میں نے اس کے کاغذات پڑھنے کا بطور معاوضہ منہا کر کے اس کو
روپیہ اور کاغذات واپس کر دیئے۔" اس وقت شاید قائد اعظم کے چہرے پر سختی آ گئی
اور بے باکی کی دمک تھی۔ فرمایا: "حسین امام! کیا میں ہر مقدمے کی پیروی کیا کروں؟
میرا کام سچائی کی حمایت کرنا ہے۔" میں ان کی باتیں خاموشی سے سن رہا تھا اور میرے دل
سے قائد اعظم زندہ باد کی صدائیں آ رہی تھیں۔

ایک مرتبہ ایک صاحب نے نادانستہ طور پر قائد اعظم کے کہنے سے میرا نام مسٹر حسین
امام کہہ دیا، میں کرسی پر تڑپ اٹھا اور ان صاحب کی اطلاع کے لئے میں نے کہا۔ قائد اعظم
بابائے قوم تھے۔ وہ ہم لوگوں سے یعنی مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ارکان میں کسی کے نام
کے ساتھ مسٹر یا صاحب یا کوئی اور اعزازی لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ البتہ صرف دو
شخصیتیں ایسی تھیں جن کو وہ تخاطب میں عزت دیتے تھے۔ ایک نواب اسماعیل خان جنہیں
قائد اعظم صرف "نواب صاحب" کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور دوسری بیگم مولانا محمد علی مرحوم
جنہیں وہ بیگم صاحبہ کہتے تھے۔ وہ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کی پہلی اور آخری خاتون رکن تھیں۔
راجہ صاحب محمود آباد کو جن کا پورا نام راجہ امیر احمد خان تھا۔ قائد اعظم صرف "امیر" کہہ کر
مخاطب کرتے تھے۔ مگر اس میں راجہ صاحب مرحوم کے کم عمر ہونے کی وجہ سے مشفقانہ خلوص
بھی شامل تھا اس لئے کہ ان کے والد صاحب سے قائد اعظم کی دوستی بہت پرانی اور گہری
تھی۔

غالباً ۱۹۴۳ء کا واقعہ ہے کہ میں جالندھر میں پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس کے ایک جلسہ
کی صدارت کرنے گیا جس کا افتتاح قائد اعظم نے کیا۔ جلسہ ختم ہوا اور مجھے بعض دوسری
مصروفیات کی وجہ سے فوراً ہی جالندھر سے آنا پڑا۔ بعد میں کالج کے پرنسپل قاضی محمد فرخ
نے جو اس جلسہ کی مجلس استقبالیہ کے چیئرمین تھے ایک ایسا واقعہ سنایا جو نوجوانوں سے
قائد اعظم کی گہری دلچسپی اور ہمدردی کے سینکڑوں واقعات میں سے ایک ہے۔

قاضی صاحب نے بتایا کہ جلسے کے اختتام پر طالب علم قائداعظم کے گرد جمع ہو گئے اور درخواست کی کہ انہیں کوئی وقت دیا جائے تاکہ وہ قائداعظم کی خصوصی گفتگو سے فیض یاب ہو سکیں۔ قائداعظم نے فرمایا کہ میں بوڑھا آدمی ہوں اور اب کھانا وغیرہ کھا کے کچھ دیر آرام کروں گا۔" اس کے جواب میں طالب علموں نے نوجوانی کے والہانہ خلوص اور شرف ملاقات کے جذبات سے بھرے ہوئے لہجے میں بلکہ ہٹ کے انداز میں کہا: "آپ زیادہ تر دلی اور بمبئی میں رہتے ہیں اور جالندھر سے ہم لوگوں کے لئے ممکن نہیں کہ شرف نیاز حاصل کر سکیں۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں موقع دیں کہ آپ کے قریب بیٹھ کر آپ سے باتیں کریں۔" قائداعظم نے بچوں کی ضد پوری کرتے ہوئے فرمایا۔ "تم لوگ دو گھنٹے بعد میری قیام گاہ پر آ جاؤ میں تم سے صرف بیس منٹ بات کر سکوں گا۔" مگر جب طلبہ پہنچے تو قائداعظم ان کے سوالات کے جوابات دینے میں اس قدر منہمک ہو گئے کہ (حالانکہ وہ وقت کے پابند مشہور تھے) طالب علموں سے دو ڈھائی گھنٹے تک باتیں کرتے رہے جو لوگوں سے ان کی محبت اور شفقت کا بہت بڑا ثبوت تھا۔

ایک دن قائداعظم سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو میں نے پی اے سے دریافت کیا کہ قائداعظم کہاں ہیں۔ تو بتایا گیا کہ سٹڈی میں ہیں۔ میں اندر گیا تو دیکھا کہ کچھ نوجوان ان کے پاس بیٹھے ہیں۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے واپس جانے کا ارادہ کیا تو کہا۔ "نہیں! آؤ۔ بیٹھو میں بچوں سے باتیں کر رہا ہوں، تم بھی ان کے سوالات سنو۔" میں بیٹھ گیا۔ نوجوان طلبہ ان سے شکایت کر رہے تھے کہ یہاں یونیورسٹی میں امتحان کے سوال بہت مشکل آتے ہیں، کتابیں بہت پڑھائی جاتی ہیں اور ایک سال کے مختصر عرصے میں اتنے بڑے کورس پر حاوی ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ کوئی صورت نکالئے کہ طلبہ کے لئے آسانی پیدا ہو۔

قائداعظم نے کہا۔ "تم کالج یا اسکول میں پڑھنے کس غرض سے جاتے ہو۔ اسی لئے نا کہ تمہاری اپنی حیثیت بڑھ سکے، پیسے زیادہ کما سکو اور ملک کی زیادہ خدمت کر سکو یا صرف فیشن کی خاطر اسکول یا کالج جاتے ہو یا پھر اس لئے کہ کھیل کود کے مواقع میسر ہیں۔" لڑکوں نے جواب دیا۔ "نہیں صاحب ہم تو علم حاصل کرنے کے لئے وہاں جاتے ہیں اور علم حاصل کئے بغیر ہم

بھی تو نہیں مل سکتا۔"

تاتا مغل نے کہا: "عزیزو! بغیر محنت و مشقت کے عزت و عظمت بھی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ انسان کو محنت ہی کا پھل ملتا ہے۔ آج تم جتنی محنت کرو گے کل زندگی میں اتنے ہی زیادہ کامیاب رہو گے۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ اس لیے تمہیں محنت سے نہیں گھبرانا چاہیے۔" پھر میز پر مکا مار کر کہا۔ یہ ان کی عادت تھی کہ جب کسی بات پر زور دینا چاہتے تھے تو میز پر ہاتھ مارتے تھے۔ "اگر تم عزت، عظمت اور بہتر خوشحال زندگی چاہتے ہو تو محنت کرنی ہوگی۔ بغیر محنت کئے کچھ بھی نہ ملے گا۔" اور پھر ان لڑکوں کو اپنی بات سمجھانے کے لیے ایک نہایت ہی عمدہ مثال دی۔ فرمانے لگے:

"تم نے چیونٹی کو دیکھا ہے کتنی چھوٹی سی چیز ہے مگر وہ دور دور سے چیزیں لا لا کر اپنے گھر میں رکھتی ہے۔ سیکڑوں بار گرتی ہے مگر اپنی ضرورت کی چیزیں جمع کرنے میں مشکل محسوس نہیں کرتی۔ وہ مسلسل کوشش سے اتنا کچھ اکٹھا کر لیتی ہے کہ آڑے وقت میں سکون و آرام سے کھا سکے تو اسی طرح انسان کا بھی ایک زمانہ محنت کا ہوتا ہے اور دوسرا حاصل پھل کا زمانہ۔ آج تم اپنی محنت سے جو کچھ حاصل کرو گے آئندہ زندگی میں اس سے تمہیں فائدہ ہوگا۔"

سارے نوجوان تاتا مغل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

مولانا جمال میاں فرنگی محلی

قائد اعظمؒ کے جلو میں

جناح صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۶ء میں راجہ صاحب محمود آباد نے کرائی۔ جن کے والد راجہ علی محمد خان صاحب سے قائد اعظمؒ کی بہت دوستی تھی۔ ان کے انتقال کے وقت راجہ صاحب کمسن تھے۔ اس لیے بورڈ آف ٹرسٹیز بنا دیا گیا جس کے چیئرمین قائد اعظمؒ تھے۔ ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ بمقام لکھنؤ کا انتظام راجہ صاحب محمود آباد نے ہی کیا تھا۔ اس سے پہلے مجھے راجہ صاحب کا ایک خط موصول ہوا۔ جس میں لکھا گیا تھا کہ مسلم لیگ کے اجلاس کے انتظامات کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جس میں آپ کا نام شامل ہے لہٰذا کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے۔ ریاست محمود آباد کی ہمارے صوبے یوپی میں بڑی اہمیت تھی۔ راجہ صاحب سے میرے خاندانی اور رفاقتی دوستانہ تعلقات تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس سے پہلے قیصر باغ میں مجلس استقبالیہ کا اجلاس ہوا۔ جس میں کئی کمیٹیاں بنائی گئیں۔ ان میں ایک پنڈال کمیٹی بھی تھی جس کا صدر مجھے بنایا گیا تھا۔ راجہ صاحب محمود آباد نے اس جلسہ میں سب سے زیادہ کام کیا۔ لال باغ پارک کے اس سالانہ اجلاس کے بیشتر مصارف بھی راجہ صاحب محمود آباد نے ہی برداشت کیے۔

کمیٹی کا اجلاس ۲۵ جولائی ۱۹۳۶ء کو ہوا۔ کنوینر کی حیثیت سے راجہ صاحب محمود آباد محمد امیر احمد خان نے جو گشتی مراسلہ کمیٹی کے ارکان کو ارسال کیا اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ آل انڈیا

مسلم لیگ کا اجلاس لکھنؤ کی روایات کے شایانِ شان ہو۔ اس کے بعد استقبالیہ کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جناح صاحب تشریف لائے تو ان کے استقبال کا انتظام کیا گیا۔ اس وقت صوبے میں کانگریسی حکومت تھی جس نے جلسے یا جلوس کرانے کے لیے "آزاد مسلم لیگ" بنا دی تھی۔ جناح صاحب کو ایک کھلی چھت کی بڑی گاڑی میں بٹھایا گیا۔ پیچھے میں اور راجہ صاحب محمود آباد برہنہ تلواریں لیے کھڑے تھے۔ جلوس بہت بڑا تھا۔ نام نہاد "آزاد مسلم لیگ" والوں نے کچھ گڑبڑ کرنے کی کوشش کی لیکن جماعت کے رضاکاروں نے ان کو روک دیا اور جلوس خیر و عافیت قیصر باغ پہنچ گیا۔ جلوس نہایت کامیاب رہا۔

لکھنؤ کے اس اجلاس میں ہر صوبے سے چند بڑے رہنما شریک ہوئے۔ ان میں وزیر اعظم بنگال مولوی فضل الحق اور وزیر اعظم پنجاب سر سکندر حیات بھی شامل تھے۔ اجلاس کی خصوصیت یہ تھی کہ مسلم لیگ کا نیا منشور ترتیب دیا گیا۔ مولانا حسرت موہانی نے اس ضمن میں قرارداد پیش کی تھی۔ اور تقریر کے دوران کہا تھا کہ وہ سیاسی ملک میں صوبوں (ریاستوں) کا ایک ایسا نظام چاہتے ہیں جس میں صوبے آزاد اور خود مختار ہوں۔ اور اگر صوبوں میں کسی زبان پر ظلم و زیادتی کی جائے تو وہ الگ ہو کر آزاد ہو جائیں۔ قائد اعظمؒ جلسہ و جلوس کے دوران ہیٹ لگائے بیٹھے رہے۔ مسلمانوں کے جذبات کو سمجھتے ہوئے نواب اسمٰعیل خان صاحب نے قائد اعظم سے کہا کہ "آپ ہیٹ کے بجائے یہ ٹوپی پہن لیں" اور اپنی قراقلی جو مولانا محمد علی، شوکت علی اور خود نواب اسمٰعیل صاحب تحریک خلافت کے وقت سے پہنتے آئے تھے، قائد اعظم کو پیش کر دی۔ ٹوپی وہی قدیم طرز کی تھی۔ لیکن جب جناح صاحب نے اسے سر پر رکھا تو اس کا نام جناح کیپ پڑ گیا۔

مولانا حسرت موہانی صاحب چونکہ روسیوں کی طرف بہت مائل تھے لہٰذا انہوں نے کہا کہ اگر کانگریس چند جماعت ساتھ نا انصافی کرے تو ہم انگریز کو چھوڑ کر روس کے ساتھ مل جائیں گے (یہ مولانا حسرت موہانی کی تقریر تھی قرارداد نہیں) قائد اعظمؒ نے خطبہ صدارت دیا۔ خطبہ انگریزی میں تھا۔ اس کا ترجمہ لکھنؤ کے حکیم حسن الدین صابری نے کیا۔ اجلاس کی خاص بات یہ تھی کہ راجہ صاحب محمود آباد نے اقتصادی ترقی کا ایک پروگرام پیش کیا

جو لیگ کے لیے ایک نئی چیز تھی۔ اس سے پہلے مسلم لیگ کی طرف سے اس قسم کا پروگرام
کبھی پیش نہیں کیا گیا تھا۔ یہ قرارداد راجہ صاحب محمود آباد نے پیش کی تھی۔

انتخابات میں مسلم لیگ کے ارکان نے کانگریسی امیدواروں کی تائید و حمایت کی تو سمجھا جا
رہا تھا کہ انگریز کی مخالفت میں ان دونوں جماعتوں کا اتحاد اچھے نتائج پیدا کرے گا۔ لیکن
خلاف توقع کامیابی حاصل ہونے کے بعد کانگریس کا رویہ ایک دم بدل گیا اور مخلوط حکومت
کے امکانات کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ کانگریس نے صاف کہہ دیا کہ کوئی کولیشن نہیں ہوگی۔
حافظ محمد ابراہیم صاحب صوبے کی کانگریسی وزارت میں وزیر ہوئے تو مسلم لیگ نے انہیں
روکا۔ مگر وہ نہ مانے۔ اور کہنے لگے کہ "میں کانگریس کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کو تیار ہوں"
قبل ازیں وہ وزیر آبپاشی تھے۔ لہٰذا اپنے حلقہ انتخاب کے تفصیلی دورہ کے بعد انہیں
اطمینان ہو گیا تھا کہ انہیں کامیابی ہوگی۔ ویسے بھی اپنے حلقے میں وہ ہر دلعزیز تھے۔ لیگ
نے چیلنج قبول کیا۔ انتخابات کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی کہ لیگ کا اجلاس ہو گیا۔ انتخابات کے
لیے چندے کی اپیل کی گئی۔ قائد اعظم نے راجہ صاحب محمود آباد سے کہا کہ ان صاحب کو
(یعنی مجھے) انتخابی مہم کے لیے چندے کی اپیل کرنے کے لیے تقریر کرنے کا موقع دیا جائے
شاید قائد اعظم کو خیال آیا کہ عام اجلاس میں تقریر کا موقع نہ ملنے پر دل شکنی ہوتی ہے میں
نے کھلے اجلاس میں تقریر کی اور میری جیب میں جو دس پندرہ روپے تھے وہ سب کے سب
اپنی ٹوپی میں رکھ کر الیکشن فنڈ میں دے دیے۔

قائد اعظم نے اس ٹوپی کو نیلام کیا جس کی بولی شاید راجہ صاحب محمود آباد نے پانچ
سو روپے لگائی تھی۔ وہ میری بہت پرجوش تقریر تھی جو خاصی کامیاب رہی۔ ضمنی انتخابات
تھے لیکن لیگ ابھی غیر منظم تھی۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے سارے رہنماؤں نے اپنی
پوری کوششیں کیں۔ سب کے سب بجنور پہنچ گئے۔ حافظ ابراہیم کے مقابلے میں
بجنور کے ایک وکیل عبدالسمیع صاحب تھے جو میونسپل کمیٹی کے چیئرمین بھی تھے۔

اس اجلاس میں قائد اعظم نے مجھ سے کہا: "میرے ساتھ بجنور چلیے" اس
وقت فرنگی محل میں میرا آخری سال تھا۔ اور تکمیل فضیلت کے امتحان ہو رہے تھے میں

قدرت متامل تھا۔ لیکن میرے اساتذہ کو معلوم ہوا تو کہنے لگے "یہ قوم کا اہم معاملہ ہے،
تم قائداعظمؒ کے ساتھ ضرور جاؤ، ہم امتحان بعد میں لے لیں گے۔" چنانچہ میں اسی
گاڑی اور اسی ڈبے میں جہاں قائداعظمؒ تشریف رکھتے تھے، بجنور گیا جہاں رات
وہاں مسلم لیگ کا ایک جلسہ تھا۔ قائداعظم کو وہاں تقریر کرنا تھی۔ پہلی بار میں نے
اردو میں تقریر کی۔ قائداعظمؒ کی تقریر سننے کے لیے بہت سے ہندو بھی آئے
تھے۔ جلسے میں مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان اور کئی دوسرے زعما بھی موجود تھے
میری تقریر کی بہت حوصلہ افزائی کی گئی۔ وہاں سے ہم نجیب آباد جانے کے لیے کار
میں سوار ہوئے۔ آگے مولانا شوکت علی اور پچھلی نشست پر قائداعظمؒ اور مولانا
ظفر علی خان تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے درمیان مجھے جگہ ملی۔ کچے راستے کی گرد
سے بچنے کے لیے ہم نے اپنے اوپر ایک چادر تان لی۔

برسبیل تذکرہ قائداعظمؒ نے مجھ سے دریافت فرمایا: "تم کیا چاہتے ہو؟ زندگی
کے لیے تمہارا مقصد کیا ہے؟" میں نے جواب دیا۔ میری خواہش ہے کہ ایک ایسا مدرسہ
ہو جو دارالعلوم اور یونیورسٹی کی حیثیت کا حامل ہو۔ یعنی مسلمانوں کا ایسا ہمہ گیر تعلیمی ادارہ
ہونا چاہیے جس میں بیک وقت دینی اور جدید علوم کی تعلیم اعلیٰ پیمانے پر دی جائے
تاکہ مسلمان مختلف علوم سے روشناس ہو جائیں۔" قائداعظمؒ نے جواب دیا "اس
کے لیے سب سے پہلے سیاسی طاقت (اقتدار) کی ضرورت ہے۔" ہم کچھ دیر کے بعد
نجیب آباد پہنچے۔ وہاں قائداعظمؒ نے جلسے میں اردو میں تقریر کی۔ رک رک کر مختصر
الفاظ میں خطاب کیا۔ اس وقت اردو کے الفاظ کا ذخیرہ محدود تھا۔ فقروں کی ترتیب
بھی انگریزی کی طرز پر تھی۔ مگر بعد میں تو انہوں نے دو دو گھنٹے تک اردو میں تقریریں
کیں لیکن انگریزی سے ان کا ہمیشہ شغف رہا۔ بہرحال ان کی مدلل انگریزی تقریروں کا جواب
نہیں ہے۔ ایک بار جب کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو" اور آزاد فوج کی تشکیل
کے موقع پر "دلی چلو" کا نعرہ لگایا تو قائداعظمؒ نے جواباً کہا: "ہنوز دلی دور است"
تھا کے الفاظ سے سوال کیا کہ یہ تو ایک تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ آپ نے کہا ان

پڑھا ہے؟ کہنے لگے۔ میرے شوفر نے مجھے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا واقعہ سنایا تھا
کہ کوئی بادشاہ ان کو تنگ کر کے ان کی خانقاہ ویران کرنا چاہتا تھا۔ وہ دہلی کی طرف روانہ
ہوا اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو اطلاع دی تو آپؒ نے فرمایا "ہنوز دہلی دور
است"۔ اس بادشاہ نے جہاں پڑاؤ ایک محل بنایا تھا اسی میں وہ ٹھہرا تھا۔ رات کو
محل گر گیا اور بادشاہ دب کر مر گیا۔

اسی وقت قائد اعظمؒ نے مجھے اپنے ڈاک بنگلے میں بلوایا۔ جب وہاں پہنچا تو انہوں نے
انگریزی زبان کی تین کتابیں مجھے دیں۔ ان میں ایک چودہ نکات کا رسالہ تھا۔ وہ کوئی
اور، میں نے کہا "جناب یہ تو انگریزی میں ہیں اور میں انگریزی نہیں جانتا۔" کہنے
لگے "تم اس کو رکھو اور انگریزی پڑھ لو!" مسلم لیگ کا احیاء ہو چکا تھا۔ الیکشن ہو
رہا تھا۔ قائد اعظمؒ مسلم لیگ اور کانگریس کے متعلق ہی بات کیا کرتے تھے۔ وہ گاندھی جی
کی تقریروں اور ان کے بیانات کا مطلب واضح کرتے اور مسلمانوں کے ساتھ کانگریس
اور ہندوؤں کی زیادتیاں بھی بیان کرتے۔ وہ ہمیشہ نوجوانوں کو مسلمانوں اور مسلم لیگ
کے مقاصد کے لیے متحد ہو جانے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ اپنے موقف کی تائید میں دلائل
اور ثبوت کے انبار ان کے پاس تھے۔

میں نے بجنور کے انتخابات میں ہندوستان کے بہت سے رہنما دیکھے۔ پنڈت
نہرو انتخابی دورہ پر آئے۔ سرحدی رہنما خان عبدالغفار خان اپنے کارکنوں کی ایک جماعت
لے کر پہنچے۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، وہ احراری جماعت کے کارکن اور مشہور کمیونسٹ
لیڈر ڈاکٹر اشرف وغیرہ سبھی وہاں تھے۔

دیوبند کے حلقہ اثر کی وجہ سے علمائے دیوبند، خود مولانا حسین احمد مدنی اور
بہت سے لوگ جن کے نام اب یاد بھی نہیں آتے، موجود تھے۔ مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی
خان، لاہور کے مشہور مزاحیہ مقرر میاں فیروز الدین، بنگال کے حاجی محمد اور مولانا حسرت موہانی
وغیرہ بھی موجود تھے۔ ہمارے جلسوں میں مجمع بہت ہوتا۔ تقریریں سننے کے لیے کانگریس
کے جلسوں سے بھی لوگ آجاتے تھے۔ مولانا ظفر علی خان نے خطابت کا کمال دکھایا اور

میں پڑھتے تھے۔ وہ سارا قصہ بھی اس کو دہراتا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں ہم رنگ پہاڑ گئے۔ ایک اجلاس میں یہ ترانہ پڑھا گیا تو کسی نے مجمع میں سے کہا کہ یہ ترانہ شیخ عبدالمجید سندھی کا ہے۔ شیخ صاحب نے شاید پوری بات نہیں سنی یا وہ سمجھے نہیں۔ اور لوگوں کا نعرہ ہائے تحسین پر انہوں نے اٹھ کر مجمع کو سلام کیا۔ مجھے کسی نے پرچہ دیا کہ یہ پرچہ سیکرٹری صاحب کو دے دیں۔ اس میں لکھا تھا کہ یہ نظم شفقت فرزند کی ہے لہٰذا اس کا اعلان کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ محترم شیخ صاحب بات کو پوری طرح سن اور سمجھ نہیں سکے تھے۔ چنانچہ بعد میں اعلان کیا گیا کہ یہ نظم شیخ عبدالمجید سندھی کی نہیں بلکہ شفقت فرزند صاحب کی ہے اور غلط اعلان پر اظہار افسوس کیا گیا۔

راجہ صاحب محمود آباد نے اپنی ریاست سے علیحدگی کا ایک خط یو پی کے گورنر کو لکھا تھا۔ گورنر نے چوہدری خلیق الزماں کو بلایا۔ وجہ شاید یہ تھی کہ جنگ میں امداد کے لیے راجہ صاحب سے چندہ مانگا جا رہا تھا جو انہوں نے دینے سے انکار کر دیا۔ اور ریاست سے علیحدگی کا خط لکھ دیا۔ چوہدری صاحب نے گورنر کو مشورہ دیا کہ وہ قائد اعظمؒ کے ذریعے راجہ صاحب سے کہیں کہ وہ اپنا خط واپس لے لیں۔ چنانچہ چوہدری صاحب نے مجھ کو خط دے کر اپنے حالات کے ساتھ بمبئی روانہ کیا۔ میں بمبئی پہنچا۔ قائد اعظمؒ کو خط دیا اور راجہ کی ریاست کا پورا واقعہ انہیں سنا دیا۔ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق نہایت تحمل سے میری بات سنی۔ خط پڑھا اور راجہ صاحب پر خفگی کا اظہار کرنے لگے۔ اتنے میں محترمہ فاطمہ جناح آ گئیں۔ انہوں نے دریافت کیا تو قائد اعظمؒ نے ان کو خاموش کر دیا۔ میں نے دیکھا خط پڑھ کر قائد اعظمؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فاطمہ جناح کو خاموش کرنے کے بعد علامت غصہ۔ میں انہوں نے اس خط کے جواب میں راجہ صاحب محمود آباد کو خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا: میرے آپ کے والد کے خاندان کے گہرے تعلقات تھے۔ میں آپ کی ریاست کے نگران بورڈ کا چیئرمین تھا۔ اس اہم فیصلے میں اور جائیداد کے متعلق جس کا میں چیئرمین تھا۔ میرے مشورے اور اطلاع کے بغیر آپ کو فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آخر میں حکم دیا گیا تھا کہ ریاست سے دست برداری کا خط فوراً واپس لیا جائے

اور مجھے مطلع کیا جائے۔ میں نے لکھ کر بھیج کردہ خط دیا تو راجہ صاحب نے جو پیسے پیش
دیا تھا فیصلہ واپس لے لیا۔

شملہ کانفرنس کے دوران قائد اعظمؒ سے ایک ملاقات تنہائی میں ہوئی۔ ان دنوں یہ افواہ گرم تھی کہ مسلمانوں کے اتحاد سے ہندو بہت متفکر ہیں۔ لہٰذا کانگریس اور مسلم لیگ میں کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو بہتر ہے۔ یہ خیال بھی عام تھا کہ قائد اعظمؒ سے زیادہ منصفانہ اور باعزت سمجھوتہ کوئی کر نہیں سکتا۔ ان دنوں قائد اعظمؒ سیسل ہوٹل شملہ میں حکومت کے مہمان تھے۔ ایک دن موقع پا کر میں قائد اعظمؒ سے ملنے ہوٹل گیا تو اس وقت وہ اسٹڈی میں تھے۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ قائد اعظمؒ ہمیشہ انگریزی میں بات کرتے اور میں ہمیشہ اردو میں جواب دیا کرتا۔ لیکن میری شکل دیکھ کر بالکل خوب تبسم فرمایا: "کہیے کیا حکم ہے؟" پھر مجھے بیٹھنے کا حکم دیا۔ میں نے بات شروع کی اور قائد اعظمؒ حسب عادت صبر و تحمل سے سنتے رہے۔ میں نے کہا: "ہم تعداد میں کم ہیں۔ مقابلتاً ہندو تعداد میں اور انگریز طاقت میں زیادہ ہیں۔ تعداد اور طاقت کا مقابلہ ہم کسی حالت میں نہیں کر سکتے۔ مسلم لیگ کی حالت سے آپ واقف ہیں۔ یعنی اس ادارے میں کس قماش کے لوگ ہیں۔ میں تو عرض کرتا تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں کوئی تصفیہ ہو جائے تو بہتر ہوگا۔ آپ کی زندگی تک تو کسی کی مجال نہیں لیکن بعد میں آثار اچھے دکھائی نہیں دیتے۔ تصفیہ اور مفاہمت کے لیے بھی آپ سے زیادہ اہل کوئی نہیں۔" یہ سن کر قائد اعظمؒ نے جو کچھ انگریزی میں کہا وہ لفظ بلفظ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ فرمایا: "جمیل میاں! ہم کمزور ہیں، تو کیا ہم کو زندہ نہیں رہنا چاہیے بلکہ خودکشی کر لینی چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ آپ نہیں سمجھتے کہ کیا ہوگا ہندوستان میں کانگریس کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے بعد وہ نہیں ہوگا جو گاندھی جی چاہیں گے یا نہرو چاہیں گے۔ بلکہ ہوگا وہ جو ہندو قوم کا بچہ بچہ چاہتا ہے۔"

میں خاموش ہو گیا۔ ملک تقسیم ہوا اور بعد میں بہت عرصے تک میں ہندوستان میں مقیم رہا۔ میں نے ہر مرحلہ پر اس واقعہ میں دیکھا کہ قائد اعظمؒ نے جو کچھ کہا تھا وہ حرف بحرف درست تھا۔ گاندھی جی نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان دہلی یا ہندوستان سے جائیں

لیکن ان کو قتل و غارت کے بعد بے کسی اور بے بسی کی حالت میں دلی سے نکلنا پڑا۔ نہرو اردو زبان کو ختم نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے باوجود اردو کو دیس نکالا ملا۔ ایسی ہی بے شمار باتیں دیکھ کر مجھے یاد آتی کہ قائد اعظمؒ کا یہ فرمانا درست تھا کہ ہندوستان میں وہی ہو گا جو ہندو قوم چاہے گی۔ لہٰذا گاندھی، نہرو، پٹیل اور بڑے ہندو رہنما کی تقریر و تحریر کی کوئی حیثیت حاصل نہ ہوگی۔ قائد اعظمؒ کی دور رس نگاہ نے ان تمام باتوں کو قبل از وقت جانچ لیا تھا۔ تنازعہ یہ تھا کہ گاندھی جی چاہتے تھے اقتدار ایک طاقت کو مل جائے خواہ اس کا وزیر اعظم مسلم ہو یا غیر مسلم۔ اور قائد اعظم کہتے تھے کہ آزادی سے پہلے اقتدار دونوں طاقتوں (مسلم لیگ اور کانگریس) کو منتقل کیا جائے۔ وہ جانتے تھے کہ آئینی یا اخلاقی تحفظات کی کوئی حیثیت نہ ہوگی۔ اگر فوج یا دفاع کانگریس یا ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو تو تحفظات خواہ کتنے ہوں، سب بے کار ثابت ہوں گے۔ مثلاً راجاؤں، ریاست نے فوج، خزانہ اور امور خارجہ انگریز کے سپرد کیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کو سب کچھ حاصل تھا لیکن وہ انگریز کے سامنے کتنے مجبور تھے یہ ہم سب جانتے ہیں۔ اس نکتہ کو قائد اعظمؒ اس وقت سمجھ رہے تھے جبکہ ہم اس کا کوئی ادراک نہ رکھتے تھے۔

قائد اعظمؒ سے تیسری ملاقات کراچی میں ہوئی۔ میں پاکستان بننے پر افتتاحی تقریبات دیکھنے کے لیے کراچی آیا (رہنے کے لیے نہیں آیا تھا) خالق دینا ہال میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ قائد اعظمؒ اب پاکستان کے گورنر جنرل تھے۔ لہٰذا ان کے اردگرد اے ڈی سی اور کچھ دوسرا عملہ تھا۔ یہ بات مجھے پسند نہ آئی۔ میں نے اس جلسے میں بڑی سخت تقریر کی۔ بعد میں ایک دعوت میں قائد اعظمؒ بھی تشریف فرما تھے۔ وہاں سردار عبدالرب نشتر (نوابزادہ لیاقت علی خان، سردار بہادر خان اور راجہ غضنفر علی خان بھی موجود تھے۔ قائد اعظم ایک صوفے پر تنہا بیٹھے تھے۔ میری تلخ تقریر کے بعد میرا ان سے ملاقات کا ارادہ نہیں تھا لیکن انہوں نے مجھے دیکھا تو بلا لیا۔ اور اس وقت مجھے ان کی جمہوریت پسندی کا ایک اور ثبوت ملا۔ انہوں نے مجھ سے کہا: "آپ یہ دیکھیں کہ میں آپ کی تقریر سے ناراض ہوں یا نہیں! مجھے معلوم ہے کہ میرے وزیر اس طرح کام نہیں کر رہے جس طرح ان کو کرنا

چاہیے۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ ان لطیفوں کی نشاندہی کی۔ میری دلچسپی کی کہ جو کچھ میں نے کہا تھا اس سے ان کی طبیعت مکدر نہیں ہوئی۔ انہوں نے اصفہانی صاحب سے جو جھجکیات ہیں، مجھے کہلوایا کہ جمال میاں ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ قائد اعظم ان کی تقریر سے ناراض ہیں، یا کبیدہ خاطر ہیں۔ ۷ اگست کو ہندوستان واپس چلا گیا اور پھر قائد اعظمؒ کی زندگی میں پاکستان نہیں آسکا۔

دسمبر ۱۹۴۹ء تک میں یوپی میں رہا۔ کیونکہ میں یوپی اسمبلی کا ممبر تھا۔ وہیں قائدؒ کے انتقال کی خبر سنی۔ اس وقت ہمارے صوبے کی گورنر سروجنی نائیڈو تھیں۔ انہوں نے قائد اعظمؒ کے انتقال پر نہایت رقت انگیز بیان دیا۔ وہ نہایت عجیب خاتون تھیں۔ انہوں نے ہی وہ واقعہ سنایا جو اب کتابوں میں چھپ گیا ہے کہ قائد اعظمؒ ان کے پاس ہوٹل تاج محل میں جایا کرتے تھے۔ وہاں ایک پارسی عورت تھی جو قسمت کا حال بتاتی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ مسٹر جناح سے پوچھو کہ ان کی تکلیف میں ان کے گھٹنے میں درد ہو جاتا ہے یا نہیں۔ میں نے مسٹر جناح سے پوچھا تو انہوں نے کہا درست ہے۔ لیکن کیا بات ہے؟ تو اس پارسی عورت نے کہا کہ اگر درد ہوتا ہے تو یہ شخص ایک دن بادشاہ بن جائے گا۔ مسز نائیڈو سے جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان بن جانے پر جو الوداعی دعوت دی تھی اس میں قائد اعظمؒ کے سیکرٹری خورشید صاحب ان کے پاس آئے اور دریافت کیا کہ کیا یہ بات صحیح ہے؟ انہوں نے کہا جس شخص نے تم کو یہ بات بتائی ہے وہ دریافت کرے تو بتاؤں گی ورنہ نہیں، کیونکہ اس شخص (یعنی جناح صاحب) سے وعدہ۔ انہوں نے یہ بات کسی سے نہیں کہی۔

<u>قائد کا تصور پاکستان</u>: بعض لوگ سوال کرتے تھے کہ قائد اعظمؒ کا تصور پاکستان کیا تھا؟ اور وہ کس قسم کا پاکستان بنانا چاہتے تھے۔ میرا جہاں تک خیال ہے وہ پاکستان کی توضیح اور تشکیل قبل از وقت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ بہت تجربہ کار شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب ان سے دریافت کیا جاتا تو وہ جواب دیتے تھے کہ پہلے کانگرس تقسیم پاکستان کو تسلیم کرے۔ مجھے یاد ہے کہ جب کانفرنس

یہ راجہ صاحب محمود آباد نے نہایت پرجوش تقریر کی۔ اور کہا "ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی قوانین رائج ہوں وغیرہ وغیرہ!"

لیکن قائد اعظم نے اس تقریر کو قبل از وقت قرار دیا اور کہا "پاکستان بن جانے دو، اسلامی قوانین سے تو فرار نہیں لیکن ان کی حدود متعین کرنا قبل از وقت ہوگا!"

احمد۔ ای جعفر

قائداعظمؒ کی لازوال یادیں

۱۹۳۴ء میں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کا ممبر منتخب ہوا تو میری عمر پچیس سال سے کم ہی تھی۔ انتخابات میں حصہ لینے کے لئے کم از کم عمر پچیس سال مقرر تھی۔ اپنے حلقے کی زبردست حمایت اور دعاؤں کی وجہ سے میں نے انتخابات میں حصہ لیا تھا اور منتخب ہونے کے بعد میں قائداعظم کی انڈی پینڈنٹ پارٹی میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ سر ابراہیم رحمت اللہ اور سر سلیمان قاسم مٹھا میرے والد کے دوست تھے۔ سر سلیمان والد کے مخالف رہے تھے، ان کے انتقال کے بعد کونسل کے ممبر بن گئے۔ ان دونوں بزرگوں نے مجھ سے کہا کہ تم ہمیشہ حکومت کا ساتھ دینا۔ جناح صاحب کا ساتھ ہرگز نہ دینا۔ سر سلیمان مٹھا نے یہ مشورہ غالباً اس لئے دیا تھا کہ قائداعظم کے ساتھ ان کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے۔ وہ دونوں کہتے تھے کہ جناح صاحب ہمیشہ انگریزوں کے خلاف بولتے رہتے ہیں۔ اگر تم نے ان کا ساتھ دیا تو حسین بھائی لالجی کی درخواست پر لارڈ ولنگڈن خاص ٹریبونل مقرر کر کے تمہاری عمر کم ہونے کے بارے میں تحقیقات کرائیں گے اور انتخابات کو ناجائز قرار دے کر تمہیں اسمبلی سے نکلوا دیں گے۔ چنانچہ رکنیت عزیز ہے تو جناح صاحب کا ساتھ نہ دینے ہی میں فائدہ ہے۔ میں نے جواب دیا، "اگر حکومت غلط کام کرے تو میں اسے درست کس طرح کہہ سکتا ہوں۔" میں نے ان بزرگوں کے مشورے پر عمل نہ کیا اور جناح صاحب کا ساتھ

دیتا رہا۔

محکمہ قانون کے سیکرٹری مسٹر ایل گراہم جو بعد ازاں سندھ کے گورنر بھی بنے تھے، وہ میرے والد کے بڑے گہرے دوست تھے۔ انہوں نے انتخابات میں کامیابی پر مجھے مبارکباد کا پیغام بھیجا۔ مقصد محض یہ تھا کہ میں ان سے مل کر اسمبلی میں سرکاری بنچوں کا طرفدار رہوں۔ لارڈ ولنگڈن پانچ سال تک بمبئی کے گورنر رہے تھے۔ میرے والد سے ان کے بھی تعلقات تھے۔ سر گراہم اور لارڈ ولنگڈن نے مجھے جیت کی مبارکباد کے پیغام بھیجے تھے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں نے کسی معاملہ پر حکومت کے حق میں ووٹ دیا اور میرے تنہا ووٹ سے حکومت جیت گئی۔ اس ووٹنگ کے بعد لابی میں سر جیمز لنڈ ہارون سے اور مسکراتا کہنے لگے۔ "ہارون بولو کیا مانگتے ہو۔ سر کا خطاب یا جج بمبئی میں دلوا دوں۔" میں نے کہا۔ "میں کچھ نہیں مانگتا۔"

۱۹۳۵ء کے انتخابات کے بعد قائداعظم سے میری ملاقات دلی میں ہوئی۔ والد کے ساتھ ان کی پرانی راہ و رسم تھی۔ والد ان سے قانونی امور میں مشورے کرتے کیونکہ قائداعظم پائے کے وکیل اور اپنی ذہانت میں بے حد مشہور تھے۔ انتخابات کے بعد وہ دہلی کی ویسٹرن کورٹ میں رہتے تھے۔

مجھے قائداعظم کی تقاریر سے متعلق چند خاص باتیں کہنا ہیں۔ قائداعظم اسمبلی میں زیادہ نہیں آتے تھے مگر جب آتے تو دوسروں کی تقریریں سنتے اور ان پر غور کرتے۔ جب وہ خود فنانس بل یا پالیسی اور غیر معمولی اہمیت کے موضوع پر تقریر کرتے تو زائرین کی گیلری کھچا کھچ بھر جاتی۔ سرکاری افسر اور خواتین ان کی تقریر سننے کے لئے گیلری میں جمع ہو جاتے۔ سامعین کو یہ غرض نہ ہوتی تھی کہ جناح صاحب حکومت کی کارگزاری اور پالیسی کے خلاف موضوع کی حمایت میں، اظہار خیال کر رہے ہیں۔ وہ تو بس ان کو بولتے ہوئے دیکھنا اور سننا چاہتے تھے۔ ان کی تقریر انتہائی سکون اور اطمینان سے سنی جاتی اور کسی طرف سے کبھی مداخلت نہ ہوتی۔ خود جناح صاحب کا وقار اور

احترام اتنا زیادہ تھا کہ مداخلت کا امکان ہی نہ رہتا۔

اس ووٹر کے چلے جانے پر انہوں نے کہا: "ارون! میں نے دیکھا ہے کبھی کبھی تم حق بات میں بھی میرے خلاف ووٹ دے دیتے ہو۔ کیا بات ہے؟ تم نے جو ووٹ دیا، اس میں حکومت درست تھی، میں صحیح تھا یا تم درست تھے۔ اپنے ووٹ دینے کا سبب بتاؤ؟"

میں نے جواباً صاف کہہ دیا کہ میرے علاقے کے مخالف حسین بھائی لالجی نے میری غریبی کی بنا پر میرے خلاف عذرداری کر دی ہے اور اگرچہ حکومت ٹریبونل مقرر نہیں کر رہی لیکن اس انتظار میں ضرور ہے کہ میں اسمبلی میں اس کی طرفداری کرتا رہوں اور جب اسمبلی کا اجلاس ختم ہو تو ٹریبونل مقرر کر دے۔ اس طرح مجھے نقصان پہنچے گا اور حکومت کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔ جواب میں جناح صاحب نے جو بات کہی وہ میں بہت سی محفلوں میں بتا چکا ہوں۔ آپ کو بھی سن کر حیرت ہوگی۔ جناح صاحب نے کہا: "مائی ڈیئر ینگ مین (میرے نوجوان دوست) زندگی میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو اپنے ضمیر کے خلاف کبھی کوئی کام نہ کرنا۔ میں نے جب سیاست کے میدان میں قدم رکھا تو اس وقت میری حالت بہت خستہ تھی۔ میں قرضے کے بوجھ سے دبا ہوا تھا۔ تمہاری حالت مجھ سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ تمہیں روپے پیسے یا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ مشکل کے باوجود میں نے اپنے ضمیر کو کبھی فروخت نہیں کیا۔ یہ جو انتخابی عذرداری کا معاملہ ہے اگر تم اپنے ضمیر کی آواز پر دیانتداری سے کام لیتے ہوئے صحیح روش اختیار کرو گے تو تمہاری رکنیت ختم ہو جائے گی مگر اسی دیانتداری کی وجہ سے تم دوبارہ بھی منتخب ہو جاؤ گے۔"

"مائی ڈیئر ینگ مین" کا فقرہ کئی مرتبہ قائد اعظم کی زبان پر آیا۔ وہ نوجوانوں کو ان کی حوصلہ افزائی کے لیے عموماً اسی قسم کے فقرے یا ایک آدھ فقرہ بول کر اس کے ہم معنی الفاظ سے مخاطب کیا کرتے تھے کیونکہ وہ فرماتے تھے کہ "نوجوان طبقے پر ہی ملک اور قوم کے مستقبل کا انحصار ہے۔ ان کو تربیت دو اور ان کی حوصلہ افزائی کرو۔"

قائداعظم سے اس واقعے کے بعد میں نے سچی بات کو حق جانا ہمیشہ ان کی تائید و حمایت کرتا رہا۔ پارٹی میٹنگ تھی یا اسمبلی کا اجلاس، جہاں میرے ضمیر کے خلاف بات ہوئی میں نے ووٹ نہیں دیا بلکہ مخالفت کی حتیٰ کہ اجلاس سے بھی نکل آیا۔

جب میں دہلی سے پونا پہنچا تو خبر آئی کہ میرے خلاف ایک ٹریبونل قائم کر دیا گیا ہے۔ یہ ٹریبونل، ہائی کورٹ کے ایک جج ایس ایس پاسکل، جسٹس ماما اور اسلامیہ کالج کے مسٹر فیضی پر مشتمل تھا۔ مسٹر فیضی نوجوان اور بڑے ذہین بیرسٹر تھے۔ میں نے قائداعظم سے درخواست کی کہ وہ مقدمہ میں میری پیروی کریں لیکن قائداعظم نے اس بنا پر میرا مقدمہ لینے سے معذوری ظاہر کی کہ وہ دہلی جا رہے ہیں۔

۱۹۴۵ء کے انتخابات ہوئے۔ مسلمانوں کی نشستیں بمبئی میں پانچ سال کے لئے تیس اور دوسرے پانچ سال کے لئے وقف ہوئی تھیں۔ اب مسلم لیگ کا دور آگیا تھا۔

۱۹۴۶ء میں بمبئی سے دو نشستیں تھیں۔ ایک نشست پر حسب معمول قائداعظم کھڑے ہوئے تھے اور دوسری نشست کے لئے مسلم لیگ نے مجھے ٹکٹ دے دیا۔ معمول کے مطابق ان دونوں نشستوں پر حسین بھائی لالجی، کانگریس اور چند ہندوؤں کی حمایت سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے مجھے کہلوایا: "تم بیٹھ جاؤ، چاہو تو پانچ دس ہزار روپے لے لو۔" لیکن میں نے انکار کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر میں بیٹھ جاؤں تو قائداعظم اس خالی نشست کے لئے حسین لال جی کو مسلم لیگ کا ٹکٹ دینے پر مجبور ہو جائیں گے یا لالجی آزاد امیدوار کی حیثیت سے لڑیں گے۔

ایک دن قائداعظم نے مجھے بلایا اور کہا کہ "احمد دیکھو! یہ حسین بھائی لال جی کتنا بے غیرت آدمی ہے۔ وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مسٹر جناح آپ احمد جعفر کو میرے حق میں بیٹھ جانے کے لئے کہہ دیں یا میں آپ کے مقابلے سے دستبردار ہو جاتا ہوں۔ اس طرح آپ بلا مقابلہ منتخب ہو جائیں گے۔" قائداعظم نے بتایا کہ انہوں نے حسین بھائی لال جی سے کہا کہ وہ مسلم لیگ کی ایک نشست ضائع کرنے پر محض اس لئے تیار نہیں کہ وہ خود بلا مقابلہ منتخب ہو سکیں۔ انہوں نے اسے بہت ڈانٹا اور صاف

کہہ دیا "باہر نکل جاؤ"۔ اس واقعے نے میری نظروں میں قائد اعظم کی عزت دوچند کر دی۔ وہ اپنے ذاتی مفاد کے لئے مسلم لیگ کا نقصان کبھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ حسین بھائی لال جی کو میرے اور قائد اعظم دونوں کے مقابلے پر شکست ہوئی۔ مجھے یاد نہیں کہ ۱۹۴۵ء میں بھی ان کی ضمانت ضبط ہوئی تھی یا نہیں لیکن اس بار وہ دونوں جگہ سے ضمانت ضبط کرا بیٹھے۔ ۱۹۴۵ء میں تو کانگریس نے قاضی عبدالحمید کو میرے خلاف کھڑا کیا تھا لیکن ۱۹۴۶ء میں کانگریس کو دونوں نشستوں پر اپنا نمائندہ بھیجنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

میری بہن کی شادی تھی۔ میں اسمبلی کے دفتر میں جمعہ کی شام بمبئی پہنچا۔ قائد اعظم علالت کے باعث آرام کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے: "تم اسمبلی کے دوران کیوں آ گئے یہاں وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟" میں نے کہا: "ایک ذاتی کام سے آپ کے پاس آیا ہوں۔" بولے: "فوراً بتاؤ کیا کام ہے۔" میں نے عرض کیا: "مجھے اپنی بہن کی شادی کی تاریخ مقرر کرنا ہے۔ آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں کہ آپ کوئی ایسا دن تجویز کر دیں جس روز آپ شرکت فرما سکیں۔ شادی ونڈسر پیلس دہلی میں ہو گی۔ جو اسمبلی کی رکنیت کی وجہ سے سرکاری طور پر مجھے ملا ہوا ہے۔" انہوں نے فرمایا: "کیا میری شرکت ضروری ہے؟" میں نے کہا: "آپ کی اور محترمہ فاطمہ جناح کی شرکت کے بغیر میں یہ شادی نہیں کروں گا۔" ڈائری نکالی اور تاریخ وقت بتا کر فرمایا: "میں ان شاء اللہ ضرور شرکت کروں گا۔" میں نے کہا: "دوسرے دن شام کو سات بجے استقبالیہ ہے۔" کہنے لگے: "بہت روپیہ خرافات کی شان و شوکت نہ دکھانا۔" اس سے آپ اندازہ کریں کہ قائد اعظم فضول خرچی کو کتنا ناپسند کرتے تھے۔ وہ سب کو اس سے روکتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی سی بات پر ان کی نظر جاتی تھی۔ مقررہ تاریخ پر قائد اعظم ٹھیک پانچ بجے تشریف لائے۔ قائد ملت لیاقت علی خان، راجہ غضنفر علی خان اور کابینہ کے دوسرے تمام ارکان بھی موجود تھے۔ میں نے قائد اعظم کی ہدایت کے مطابق ساٹھ ستر سے زیادہ آدمیوں کو دعوت نہ دی۔ دوسرے دن پارٹی میں قائد اعظم محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ ٹھیک

سات بجے پہنچ گئے۔ اس وقت تک گھر والوں کے سوا کوئی مہمان بھی نہیں آیا تھا۔ قائداعظم آئے، سب سے ملے اور ساڑھے سات بجے خوش خوش تشریف لے گئے۔ عام طور پر لوگ دعوت وغیرہ میں دیر سے پہنچتے ہیں۔ فوٹو گرافر بھی نہیں آیا تھا۔ ہم نے معذرت کی تو فرمانے لگے: "کیا ہوا میرے گھر پر آکر وہاں فوٹو کھینچ لیں گے۔" کونسل آف اسٹیٹ کے ایک رکن اور میرے دوست بریگیڈیئر احتشام بھی موجود تھے۔ انہوں نے قائداعظم سے کہا: "میں نے واشنگٹن کے مشہور لارڈ ہانسے اور ان کے ساتھی مسٹر ایک میکول کے اعزاز میں اپنے گھر پر ایک دعوت کا اہتمام کیا ہے آپ بھی آئیے۔" قائداعظم نے شرکت سے معذوری ظاہر کی۔ بریگیڈیئر صاحب کو پوچھنا تو نہ چاہیے تھا لیکن انہوں نے دریافت کر ہی لیا: "آپ میری پارٹی میں کیوں نہیں تشریف لے آئیں گے؟ آپ یہاں تو آگئے!" قائداعظم نے کہا: "یہ میرے ایک دوست کی بہن کی شادی ہے اس لئے آگیا۔ لیکن میں عام پارٹیوں میں نہیں جاتا۔" مجھے علم ہے یوں ان کا جی چاہتا تو عام پارٹیوں میں بھی چلے جاتے تھے لیکن اگر کارڈ پر لکھا ہوتا کہ گورنر جنرل یا کسی اور کے اعزاز میں تو وہاں نہیں جاتے تھے۔ انہوں نے جواب دیا۔

"میں آپ کی دعوت میں شرکت نہ کر سکوں گا۔ آپ اپنے لارڈ ہانسے کو اپنے پاس ہی رکھئے۔"

قائداعظم کسی بڑے سے بڑے لارڈ، وائسرائے یا حاکم کے رعب میں نہیں آتے تھے کیونکہ وہ بہت کھرے انسان تھے۔

ذہنی و فکری تربیت کے ساتھ ساتھ قائداعظم کو مسلمانوں کی جسمانی تربیت اور صحت سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ ایک مرتبہ میرا بھائی بمبئی سے دلی آیا ہوا تھا۔ ہم ٹینس کھیل کر دہلی جم خانہ سے سیدھے قائداعظم کے پاس گئے۔ کارڈ بھیجا تو انہوں نے فوراً بلا لیا اور ہم دونوں کو کھیل کے لباس میں دیکھ کر پوچھا: "کہاں کھیل آئے۔ کیا کھیل رہا؟" میں نے کہا: "ٹینس کھیل کر آرہے ہیں۔" تو بہت خوش ہوئے اور کہا: "صحت کے لئے کھیلنا ضروری ہے۔ میں بھی ایک زمانے میں کھیلتا تھا۔" میں نے کہا: "علی جیم خانہ

کے قریب ہی گاندھی گراؤنڈ ہے آپ وہاں کھیلئے"۔ نہایت تاسف کے ساتھ بولے۔

"ہاں ہے لیکن اب میرے پاس وقت کہاں ہے؟"

قیام پاکستان کے بعد اولمپک ہونے والے تھے۔ میں قائد اعظم کے پاس گیا اور کہا کہ پاکستان بن گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ۱۹۴۸ء کے اولمپک میں پاکستانی کھلاڑیوں کی جماعت بھی حصہ لے۔ قائد اعظم بہت خوش ہوئے اور کہا "بہت اچھا اور مناسب خیال ہے میں چاہتا ہوں کہ اولمپک پینڈ میں اور اولمپک کے میدان میں پاکستان کا پرچم لہرائے۔ پاکستان نیا ملک ہے۔ میں چاہتا ہوں یہ بھی قوموں کی برادری میں شامل ہو جائے۔" انہوں نے دریافت کیا: "اس معاملے میں مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے کہا: "ہم چاہتے ہیں اولمپک میں ہماری ٹیم ضرور جائے گی لیکن اس کے لئے سب سے پہلے ہمیں پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کو تسلیم کرانا پڑے گا۔ چونکہ پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کو تسلیم کرانے کے لئے بڑے بڑے عالمی رہنماؤں سے ملاقات کا موقع ملے گا لہذا پاکستان کے بارے میں بھی ان ممالک تک حقائق پہنچ سکیں گے اس لئے مجھے باہر جانے کی اجازت چاہیئے۔" قائد اعظم نے کہا کہ "میں ہر طرح تمہاری تائید کرتا ہوں۔" چنانچہ میں ایسوسی ایشن کا صدر اور مسٹر احسن کاظمی اس کے سیکرٹری بنا دیئے گئے اور میں نے لندن جا کر اپنا ایسوسی ایشن کا الحاق عالمی فیڈریشن میں کرا لیا۔ اس پر قائد اعظم نے ہمیں مبارکباد دی اور اظہار تحسین کیا۔

چند روز بعد میں نے دوبارہ قائد اعظم سے مل کر کھلاڑیوں کی تربیت وغیرہ کے لئے رقم، نئے کیمپ کھلاڑیوں کو تیار کرنے، ان کے کھیل کا معیار جانچنے پھر اولمپک کے لئے ان میں سے مناسب افراد کے انتخاب، ان کی آمد و رفت، رہائش اور خوراک کا بندوبست اور اس طرح کے بہت سے کاموں کے لئے روپے کی ضرورت تھی۔ قائد اعظم نے کہا: "اب روپیہ کہاں سے آئے گا نیا نیا ملک ہے۔ مہاجر آ رہے ہیں۔ لٹے پٹے تباہ حال ہو کے ملک کا اثاثہ ہندوستان نے روک رکھا ہے۔ سرکاری طور پر جو لوگ آ گئے ہیں اصول یا ذہنی طور پر ان کے آنے کا بھی انتظام نہیں ہے۔ تم کو روپیہ چاہیئے تو تاجروں اور

سرمایہ داروں سے حاصل کرو!

بھارت گورنمنٹ نے کراچی اور دوسرے پاکستانی شہروں سے ہندوؤں کو لے جانے کے لئے جہازوں کا انتظام کیا تھا۔ بمبئی میں میرے احباب نے مجھ سے کہا "تم جاؤ! قائد اعظم سے کہو کہ جس طرح نہرو بہار وغیرہ ہندوؤں کو پاکستان سے لے جا رہے ہیں اسی طرح قائد اعظم ہم کو بھی پاکستان پہنچانے کا انتظام کریں کیوں کہ نہرو نے ہم سے پاکستان جانے کے لئے وعدہ لیا تھا۔"

جب میں نے قائد اعظم سے کراچی پہنچ کر یہ بات کہی تو انہوں نے جواب دیا: "مجھے وہ لوگ اب تک یاد ہیں لیکن اس وقت میرا جہاز بالب بھرا ہوا ہے۔ اسی میں جگہ ہوگی تو میں سب کو بلا لوں گا۔

"پاکستان سب کا ملک ہے۔ یہ بنگالیوں، پنجابیوں، بلوچوں یا صرف پٹھانوں کا نہیں ہے۔ یہ برصغیر کے تمام مسلمانوں کا وطن ہے۔ ان سے کہو کہ ابھی ٹھہریں۔ ابھی مت آئیں۔ میرا جہاز اور بھر گیا تو یہ ڈوب جائے گا۔ مجھے ملک کو بنانا اور مضبوط کرنا ہے، تھوڑا انتظار کریں۔" قائد اعظم نے مجھے بمبئی جا کر یہ پیغام پہنچانے کی ہدایت کی۔

ایک ماہ بعد میں قائد اعظم کے پاس پھر گیا۔ اوبلک کمیٹی کے ممبر حسن احمد خان، ایم کے خان، ملک مجید وغیرہ جو ہماری آرگنائزنگ کمیٹی کے ارکان تھے، میرے ساتھ تھے۔ میں نے قائد اعظم سے کہا: "ہماری تجویز یہ ہے کہ ہم لندن کی ٹائمز کمپنی سے ٹکٹ چھپوائیں۔ آپ مجھے اجازت دیں۔ اس اجازت نامے کے بعد میں آپ کو پانچ لاکھ روپے دوں گا۔ پانچ لاکھ میں اخراجات کے لئے رکھوں گا۔" قائد اعظم اس تجویز پر خوش ہوئے اور مطمئن ہو کر کہا: "بہت اچھا خیال ہے۔" لیکن قائد اعظم نے جب اپنے ملٹری سیکرٹری مسٹر ایم اے ایچ زبیری (حسرت حسین زبیری) سے مشورہ کیا تو انہوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ زبیری صاحب نے کہا: "قائد اعظم! آپ اس کی اجازت نہ دیں۔ ہمارا ملک نیا ہے اور بہت سے چھوٹے چھوٹے ملک لوٹ کی طرح یہ ٹکٹ وغیرہ چھپوا کر دنیا میں بدنام ہو چکے ہیں۔ اب انہوں نے یہی دھندا اختیار کیا ہے۔" مسٹر زبیری نے مجھ

نے کہا: "جعفر صاحب! آپ قائداعظم کو مشورہ دیں کہ گراؤنڈ کوئی اور ایسوسی ایشن
کی تعمیر کا نام لے کر اٹھنے کی اور کمیٹی کی صورت میں دس لاکھ کے ٹکٹ چھاپنے کی اجازت
دی جائے اس طرح اگر دو سال میں پچیس تیس ہزار ٹکٹ چھپ گئے تو پاکستان بدنام
ہو جائے گا۔ اگر تم کہو تو میں قائداعظم سے بات کر کے تمہیں ویسے روپیہ دلوا دوں گا۔"
قائداعظم نے مجھ سے کہا۔ "میں تم کو حکومت کی طرف سے ایک لاکھ روپے دوں گا پانچ
لاکھ کی بات بھول جاؤ۔ باقی روپیہ قرض لے کر انتظام کر دو۔" میں قائداعظم کے
ایک لاکھ روپے کے عطیے سے بہت خوش ہوا۔ یہ مارچ ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ اپریل میں
کھیل ہونے والے تھے۔ تاریخ قائداعظم نے خود مقرر کر دی اور کہا "میں مقررہ تاریخ
پر آؤں گا اور افتتاح کروں گا۔" قائداعظم آئے اور انہوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا۔
"صحت مند قوم کے لئے صحت مند جسم بہت ضروری ہے۔"

قائداعظم کہا کرتے تھے کہ ہمارے لڑکے اور لڑکیاں مضبوط ہوں گے تو ہماری قوم بھی
قوی ہو گی۔" وہ جلد سونے اور جلد بیدار ہونے کو بہت پسند کرتے تھے۔ خود بھی دوسرے
لیڈروں کے مقابلے میں جلد سو جاتے اور جلد بیدار ہوتے۔ صبح جلدی اٹھنا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ
سارے اخبار دیکھنا ان کا روز کا معمول تھا۔ کھیلوں، جسمانی ورزش اور نوجوانوں کی جسمانی
صحت میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔

انہی دنوں میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ہمارے کھلاڑیوں کو گورنر جنرل
ہاؤس میں پارٹی دیں تو کھلاڑیوں کی ہمت افزائی ہو گی۔ قائداعظم نے اس تجویز کو بہت
پسند کیا اور کہا کہ "میں اپنے نوجوان کھلاڑیوں کے ساتھ اپنے وزیروں اور غیر ملکی سفیروں
کو بھی بلاؤں گا۔" ۲۴ اپریل ۱۹۴۸ء کی دعوت میں قائداعظم سرکاری افسروں کے ساتھ
اپنی گھوڑا گاڑی میں آئے۔ ان کے باڈی گارڈ اور ان کا دستہ بھی موجود تھا۔ وہ تین بجے
بعد دوپہر محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ پہنچے۔ انہوں نے سرکاری سواری میں ایک چکر لگایا۔
اس وقت گرمی بہت تھی۔ لوگوں نے اصرار کیا کہ ایک چکر اور لگائیں۔ اتنی گرمی کے باوجود
انہوں نے اسی طرح دوسرا چکر لگایا۔ کھیلوں کا افتتاح کیا پھر ساڑھے پانچ بجے تک بیٹھے

اڑھائی گھنٹے تک ہمارے ساتھ رہے۔ وہ بہت خوش تھے۔ اتنا خوش میں نے انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ گاڑی سے اتر کر کرسی تک دور سے گزر گئے اور کھیلوں کا افتتاح کیا۔ کھیل دیکھے اور بہت ساتھ چائے پی۔ یہ نہایت نادر، نجی اور یادگار موقعہ تھا، افسوس کہ اس تقریب کی فلم نہیں لی گئی۔

ان کے باڈی گارڈ کرنل سید اکبر حسین سے ایک بار میں نے پوچھا کہ قائداعظم ویک اینڈ کس طرح مناتے تھے تو انھوں نے بتایا کہ وہ ساحل پر ہاکس بے جانے کا کوٹ برجس اور شفقتہ جوراب پہنتے اور باہر چلے جاتے لیکن ان کے ساتھ چار چھ بکس فائلوں کے بھرے ہوتے تھے۔ مطلوبہ جگہ پہنچ کر کام میں لگ جاتے۔ بس یہ تفریح تھی!! میرے ایک دوست محمد شریف وزارت قانون میں جوائنٹ سیکرٹری تھے وہ بتاتے تھے کہ قائداعظم اسمبلی میں پیش ہونے والے مسودات بل غور کر کے پڑھتے اور ان میں ترمیم کیا کرتے تھے۔ پاکستان بن رہا تھا اور ان کو تعمیر پاکستان کا بے حد خیال تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ملک انھوں نے بنایا ہے تو اس کی تعمیر بھی انہی کے ہاتھوں ہو جائے۔ ویسے وہ گولف یا کرکٹ اور کھیل نہیں کھیلتے تھے۔ بس لان میں تھوڑا بہت ٹہل لیتے تھے۔

قوت سے مخالفت کی۔ میری مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ میں دیانتداری سے یہ سمجھتا تھا کہ مسلمان
اقتصادی اعتبار سے اس وقت ایک انتہائی نازک صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ اگر
قائدؒ نے انہیں جیل جانے کا حکم دیا تو کثیر تعداد میں یہ لوگ ان کی آواز پر لبیک کہیں گے
لیکن اقتصادی بدحالی کے سبب ان کے جیل جانے کے بعد اہلِ خانہ سخت مشکلات
سے دوچار ہو جائیں گے۔ اور ایسے حالات میں ممکن ہے کہ لیگ کی تنظیم میں انتشار پیدا
ہو جائے۔ بہرحال یہ تجویز اس وقت عوام کے لیے کسی طور مناسب نہ تھی جو ہمارے لیے بہت
اہم تھے اور جن کے یقین و اعتماد کو ہر قیمت پر بحال رکھنا ضروری تھا۔ میں صرف لیڈروں
کی حد تک جیل جانے کے حق میں تھا۔ بالآخر بات چیت کے بعد قائد اعظمؒ نے فیصلہ کیا کہ
مسلم لیگ کے کارکن گرفتاریاں دینے کے لیے پیش نہیں ہوں گے۔ مجھے یاد ہے کہ قائد اعظمؒ نے
ایک تقریر میں کہا تھا "ہمیں پہلے اس تجویز کے بعد حقوق محفوظ کر لینا چاہئیں۔" دراصل عام
گرفتاریوں کا سلسلہ کانگریس نے شروع کیا تھا۔ ہم نے شروع نہیں کیا تھا۔ وجہ یہ بھی
کہ بعد میں پتہ چلا کہ مسٹر گاندھی نے عام گرفتاریوں کی مہم کو اس بنیاد پر ختم کر دیا کہ کانگریس
نے سوچا کہ تمام لیڈروں کو گرفتار کرا دیا تو مسلم لیگ کو آزادی سے سیاسی کام کرنے کا موقع
مل جائے گا اور پھر کانگریس بھی مطالبۂ پاکستان کو ماننے پر مجبور ہو جائے گی۔ عام طور پر
لوگ قائد اعظمؒ کو سنگدل کہتے تھے لیکن حقیقت میں وہ نرم دل انسان تھے۔

ایک بار میں نے تجویز کیا کہ پارٹی کا جھگڑا ختم کرنے کے لیے وہ خود مسلم لیگ کے لیڈر نامزد
کریں۔ قائد اعظم کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا: "اس بات سے تمہارا مقصد کیا
ہے؟ میں اس قسم کی باتیں سننے کا ہرگز روادار نہیں۔ کیا تم مجھے ڈکٹیٹر بنانا چاہتے ہو؟ لیکن تمہارا
یہ مشورہ کسی صورت قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں۔" میں نے نہایت ادب سے عرض کیا: "میں
تو خود بھی جمہوریت کا قائل ہوں۔ میرا مزاج آمریت کی طرف ہرگز نہیں۔ میں نے یہ تجویز پارٹی
کے مفاد میں پیش کی ہے۔ یوں ہم ان لوگوں سے محفوظ ہو جائیں گے جو اپنی جاہ طلبی
کی خاطر آگے بڑھ کر پارٹی کی تنظیم یا اس کے اتحاد پر کوئی برا اثر ڈالیں۔ اسی لیے اس
مسئلے کو ہم آپ کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔" انہوں نے جواب دیا: "ایسا کرنا جمہوری کام

کے منافی ہو گا؟" میں نے پھر عرض کیا: "فرض کیجیے کہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ ایک قرارداد
کے ذریعے یہ فیصلہ آپ پر چھوڑ دے تو کیا یہ جمہوری طریقہ کار درست ہو گا؟" قائداعظمؒ نے سیدھی
اس بات کا جواب نہیں دیا لیکن انجام کار ہوا یہی کہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ایک
قرارداد کے ذریعے آخری فیصلے کا اختیار قائداعظمؒ کو دے دیا اور اس نازک مرحلے پر ہمیں
ان کی قیادت کے اصل جوہر دیکھنے کا موقع ملا۔ مسلم لیگ عارضی کابینہ میں برابر نمائندگی کا
مطالبہ کر رہی تھی۔ اور ہمارا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ لیکن جب نامزدگیاں عمل میں آئیں تو
معلوم ہوا کہ پانچ مسلم نشستوں میں سے چار مسلمانوں کو ملیں اور ایک نشست پر قائداعظمؒ
نے ایک اچھوت کو نامزد کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک مدبر کی حیثیت سے ان کی بڑی کامیابی
تھی۔

مطالعہ کا شوق

نمائش ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ لیکن ان کے بظاہر دبلے پتلے جسم میں
بلا کی توانائی ہمت اور قوت تھی۔ اپنے امیرانہ ماحول کے باوجود نہایت سادہ زندگی بسر
کرتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت لوگوں سے ملنے جلنے میں گزرتا۔ ان ملاقاتیوں میں غیر
ملکی صحافی بھی ہوتے اور ان کے ہم قوم مسلمان بھی! بیشتر وقت اپنے نصب العین کو لوگوں
کو سمجھانے اور اسے آگے بڑھانے میں صرف ہوتا تھا۔ اگر کسی کا ذاتی مسئلہ ہوتا تو وہ
ہمیشہ اس سے ملنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ چہل قدمی انہیں پسند تھی۔ اور ان کا باغ
باغ نہایت پر بہار اور خوبصورت تھا جہاں چہل قدمی کا شوق پورا کر لیا کرتے تھے۔ لیکن
ان کا زیادہ وقت مطالعے کے کمرے میں گزرتا۔ یہ خلوت انہیں بہت محبوب تھی۔ اس
چھوٹی سی خلوت گاہ میں وہ خاص خاص لوگوں سے ملا کرتے تھے۔ کبھی کبھی یہ ملاقاتیں
کھانے کے دوسرے کمرے میں بھی ہوتی تھیں۔ مثلاً جب ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی تھی
تو وہ اپنی خواب گاہ میں ہم لوگوں کو بلا لیتے۔ آخری زمانے میں جب میں ان سے ملنے گیا تو
مجھے یہ دیکھ کر سخت دھچکا لگا کہ وہ شدید بیمار ہیں۔ میں نے اپنی تشویش کا اظہار کیا تو
انہوں نے فرمایا۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ خدا اپنے حفظ و امان میں رکھے گا۔" جب قائداعظمؒ

کسی اہم مسئلے پر سوچتے تو گھوما اپنے باغ میں ٹہلتے رہتے بعد مسلم لیگ کے زعماء سے گفتگو کرتے جاتے تھے۔ اور مسئلے کو سوچتے بھی رہتے۔ اُن کے بارے میں میرا تاثر یہی ہے کہ وہ ایک عام آدمی جیسی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور عام طور پر سوشل تقریبوں اور ڈنر پارٹیوں وغیرہ میں جانے سے احتراز کرتے تھے۔

فخر ماتری

"نوجوان میری امیدوں کا سہارا"

۱۹۴۶ء کی ایک پرانی بات بھی کل کی طرح ذہن میں تازہ ہے جس نے میرے خیالات کی دنیا
بدل دی اور قومی خدمت کی پہلی کرن میرے دل سے پھوٹی۔ میرے چھوٹے سے گاؤں میں
مسلمانوں کی تعداد صرف ایک ہزار تھی۔ جنوری ۱۹۴۶ء میں قائد کی طرف سے شیخ ایم کے نام ایک تار آیا۔
جس میں لکھا تھا "مسلم لیگ کی تائید کرو"۔ مجھے علم تھا ایم نے جواب دیا۔ مسلم لیگ کیا ہے؟
اس کی تائید کیسے ہو سکتی ہے؟ اور کون مجھے واقف کرتا ہے؟ اس کے متعلق ہر شخص کے سوال
کا جواب میں نے دیا۔ بیس سال پیشتر کے اس واقعہ کو یاد کر کے قائد کی عظمت پر غور کرتا
ہوں تو ایک سکتہ کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مگر یہ مجھے قریب تھا میری پہلی ملاقات تھی اور اس
تحفے نے ۱۰۰ روپیہ کر دیا تھا۔ میں اس زمانے میں صوبہ بمبئی کے ضلع کھیڑہ میں تھا
احمد آباد میں گاندھی جی نے آشرم کھولا تھا۔ سول نافرمانی کی تمام تحریکیں واردھا سے پہلے
احمد آباد کے صابرمتی آشرم سے ہوا کرتی تھیں۔ ولبھ بھائی پٹیل بھی ضلع کھیڑہ کے رہنے
والے تھے۔ اور اس وقت وہ ضلع سیاسی بیداری کا مرکز بنا ہوا تھا۔

گاندھی جی نے سب سے پہلے سول نافرمانی کا تجربہ بھی اس ضلع سے کیا تھا۔
ہندوؤں کی سیاسی بیداری بھی اس ضلع سے پروان چڑھی تھی۔ کانگریس کا اس ضلع کے
سب سے بڑے شہر نڈیاد میں مسلم لیگ کے امیدوار کی تائید کے لیے قائداعظم ایک
جلسے سے خطاب کرنے کے لیے تشریف لانے والے تھے۔ میں بہت خوش تھا

مگر میں نے یہ بھی سنا تھا کہ کانگریس مسلمانوں کو ورغلا رہی ہے۔ کانگریس نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ ولبھ بھائی پٹیل کے اس قلعہ میں مسٹر جناح کو زبان نہ کھولنے دی جائے۔

میں نے قائد اعظم کو پہلی بار وہاں دیکھا۔ افواہیں گرم تھیں کہ مخالفانہ نعرے لگائے جائیں گے۔ سیاہ جھنڈیوں سے ان کا استقبال ہوگا۔ جلسہ پر پتھراؤ ہوگا اور مسٹر جناح کو اسٹیج سے اتار دیا جائے گا۔ جب یہ خبر قائد اعظم کو پہنچی تو انہوں نے مسکرا کر فرمایا: "ان سے میں نہیں ڈرتا۔ مجھے مسلمانوں سے گفتگو کا موقع ملنا چاہیے۔ بس یہی کافی ہے۔"

جلسہ ہوا۔ مسلمانوں سے زیادہ ہندو جمع تھے۔ انتہائی ہنگامہ آرائی کے باوجود قائد کی پیشانی پر بل نہ پڑے۔ ٹوٹی پھوٹی اردو میں انہوں نے مسلم لیگ اور مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا ذکر کیا۔ چیخ و پکار اور جھگڑے کے باوجود انہیں جو کچھ کہنا تھا کہہ گئے۔ اس کے بعد ان کی خدمت میں چند نوجوان حاضر ہوئے جن میں سے ایک میں بھی تھا۔ ہم کو دیکھ کر قائد نے فرمایا: "قوم کے نوجوان ہی میری امیدوں کا سہارا ہیں۔ میرا یہ پیغام مسلمانوں کے گھر گھر تک پہنچا دو!"

قائد اعظم سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ پہلی ملاقات تحریری اور دوسری بالمشافہ مگر دونوں ملاقاتوں کا ماحصل ان کے احکامات تھے۔ ولبھ بھائی پٹیل کے آہنی قلعہ میں دراڑ پڑ چکی تھی۔ قائد اعظم کی یہ عظیم فتح آنے والے واقعات کا پیش خیمہ تھی۔ ۱۹۴۰ء میں لیگ فنڈ کے اجراء کے سلسلے میں وہ گجرات کاٹھیاواڑ کے دورے پر تشریف لائے۔ وہ احمد آباد میں مسلمانوں سے خطاب کرنے والے تھے۔ کھیڑے ضلع کے مسلمان بھی آپ کا دیدار کرنا چاہتے تھے۔ لوگ قریہ قریہ سے پیدل اور سواریوں پر چلے آ رہے تھے۔ اسٹیشن پر مسلمانوں کا ہجوم عظیم تھا۔ میں اس زمانے میں کھیڑا ضلع مسلم لیگ کا صدر تھا۔ پھولوں کا ہار پہنانا اور ایڈریس کی تحسین پیش کرنا میرے ذمے تھا۔ ٹرین رکی، فرسٹ کلاس کے کمپارٹمنٹ میں بلیک سوٹ میں ملبوس قائد اعظم کھڑے مسکرا رہے تھے۔ نعرۂ تکبیر کی گونج میں انہوں نے دو منٹ کی تقریر میں فرمایا: "مسلمانو! اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرو۔ متحد ہو جاؤ اتحاد تمہاری غربت کو امارت میں تبدیل کر دے گا۔" شدت جذبات سے مغلوب ہو کر

ہجوم نے اپنے نعروں سے اسٹیشن سر پر اٹھا لیا۔ میں نے آگے بڑھ کر نہایت عقیدت سے
پھولوں کا ہار ان کے گلے میں ڈالا۔ دو پانوں کی تھیلی پیش کی۔ مسکرا کر مصافحہ کرتے ہوئے
قائداعظمؒ نے مجھ سے فرمایا "اپنے آپ کو منظم کرو" ان لفظوں میں کتنا جادو تھا۔ اس
چھوٹے سے جملے میں کتنا اثر تھا۔ یہ بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ
میرے ضلع کے مسلمان بہت غریب ہیں۔ ان کا یہ حقیر تحفہ قبول فرما لیجیے۔ قائدؒ نے
اردو میں فرمایا "فکر مت کرو، سب اچھا ہو جائے گا" اتنے میں ٹرین چل دی۔ ایک
عقیدت مند قائدؒ کے کمپارٹمنٹ میں گرتا پڑتا جا گھسا۔ ٹرین کی رفتار تیز ہو گئی۔ وہ اگلے
اسٹیشن پر گاڑی سے اتر گیا۔ واپس پہنچا تو ہم نے اس سے پوچھا "یہ کیا دیوانگی ہے؟"
کہنے لگا "مجھے قائدؒ کا دل دیکھنا تھا۔ جب ٹرین کی رفتار تیز ہونے لگی تو قائدؒ نے میرا ہاتھ
پکڑ کر مجھے اندر کھینچ لیا۔ اور کہا "چلتی گاڑی میں اس طرح نہیں چڑھنا چاہیے۔ اس میں
خطرہ ہے۔ اس وقت ہم میدان جنگ میں ہیں۔ اور ایک ایک مسلمان کی جان کی حفاظت
ہمارا فرض ہے۔" یہ واضح ہے کہ اس دور میں قائداعظمؒ کو جان کا خطرہ تھا۔ لیکن اس شخص
کے بارے میں بغیر کچھ جانتے ہوئے بھی وہ مسلمان کی جان کی حفاظت اپنا فرض تصور
کرتے تھے۔ انہیں مغرور اور سخت گیر کہنے والے اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے۔

موربی میں مسلم لیگ کی دوسری کانفرنس تھی۔ پنڈال تیار ہو رہا تھا۔ میں انتظامات
کا معائنہ کرنے گیا۔ ہم وہاں تھے کہ ایک موٹر رکی اور قائداعظمؒ اس میں سے اترے۔ ان کے
ہمراہ محترمہ فاطمہ جناح بھی تھیں۔ لیگ کے کارکن انہیں دیکھ کر دوڑ پڑے۔ قائداعظمؒ نے
فرمایا "رات کی کانفرنس کے لیے کیا کیا انتظام ہوا ہے۔ میں یہی دیکھنے آیا ہوں۔" یہ سخت گرمی
کا وقت تھا۔ اور سخت دھوپ پڑ رہی تھی۔ اس حالت میں اتنی جزوی چیزوں کا خیال بھی
انہیں بے چین رکھتا تھا۔ اس واقعہ سے ان کی عظمت میرے دل میں فزوں تر ہو گئی۔

رات کو کانفرنس شروع ہوئی۔ جیسے شامیانے پر بیٹھے ہوئے قائدؒ کا جاہ و جلال دیکھنے
سے تعلق رکھتا تھا۔ مسلمانوں کی نظریں قائدؒ پر جمی ہوئی تھیں اور فضا زندہ باد کے نعروں
سے گونج رہی تھی۔ میں نے قائدؒ کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ ان کی نگاہوں میں ایک عجیب

بجلیاں کوند رہی ہیں ۔ چہرے کا جلال اپنے عروج پر تھا ایک نور تھا ، ایک تجلی تھی
ان بیس سال پہلے کا ہی ذکر ہے ۔ مگر میرے ذہن میں آج بھی وہ اسی قدر جلال میں میرا
قائد کبھی عمر رسیدہ نہ ہوا۔

اس کی زبان اس کی رفتار اور اس کا اسلوب سب جوان تھے ۔ قائد کی شخصیت
حقیقت میں قوم کی تجلی تھی ، وہ کبھی بوڑھے نہ ہوئے ، وہ کبھی بھولے نہیں گئے اور وہ
کبھی بھولے نہیں جا سکتے ۔

بہادر یار جنگ دارالعلوم حیدرآباد (دکن) میں میرے ہم سبق اور اسی زمانے میں
بہت دوست تھے۔ میں تعلیم حاصل کر کے یورپ سے واپس ہوا، تو اس وقت بہادر یار جنگ کی
عظیم شخصیت ابھر کر سامنے آچکی تھی۔ وہ ایک مسلم رہنما، ایک اعلیٰ مقرر اور مجلس اتحاد المسلمین
کے صدر بن چکے تھے۔ اور عام طور پر مانا جاتا تھا کہ مولانا محمد علی کے بعد اردو زبان کے سب
سے بڑے خطیب اور مقرر نواب بہادر یار جنگ ہی ہیں۔ قائداعظمؒ کی نظرِ انتخاب نے انہیں
ان ریاستوں میں مسلم لیگ کی قیادت کے لیے چن لیا تھا اور وہ مسلم لیگ کے ہر سالانہ جلاس
کے مرحلے پر قائداعظمؒ کی خواہش کے مطابق ایک ولولہ انگیز تقریر کیا کرتے تھے۔ اور سامعین کو
مسحور کیے رکھتے تھے ایسے ہی ایک اجلاس میں شرکت کا موقع مجھے بھی ملا۔

۱۹۴۳ء میں جب مسلم لیگ کے اجلاس کے موقع پر میں علی گڑھ سے یونیورسٹی کی
میٹنگ سے واپس آ رہا تھا۔ تو وہ دہلی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں مولوی عبدالحق کے
یہاں ٹھہرا ہوا تھا کہ نواب بہادر یار جنگ نے مجھے ٹیلیفون کیا کہ "ڈاکٹر! فوراً یہاں آ جاؤ" جب میں
ان کے پاس گیا تو انہوں نے بتایا کہ قائداعظمؒ کھانے پر تشریف لا رہے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ
اس میں تم بھی شامل ہو۔ قائداعظمؒ مجلس میں بات چیت کریں گے۔ اس لیے کہ جلسوں وغیرہ
میں ان سے کھل کر بات کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ قائداعظمؒ آئے۔ تعارف کے بعد بات چیت
کا آغاز ہوا۔ میں تو محض تماشائی تھا۔ زیادہ گفتگو تو نواب بہادر یار جنگ اور قائداعظمؒ کے درمیان
ہو رہی تھی۔

قائداعظمؒ کانگریس کی "ہندوستان چھوڑ دو تحریک" کے بارے میں اظہار خیال کر رہے تھے۔
وہ کہہ رہے تھے کہ کانگریس نے ہندوستان چھوڑ دو مہم تیز کر دی ہے اور کانگریس چاہتی ہے
کہ ہندو اکثریت ہندوستان کی حکومت خود لے لے۔ اس لیے مسلم لیگ کو بھی اپنی تحریک کو تیز کر
دینا چاہیے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہندوؤں کے دباؤ میں آ کر انگریز ان کے حق میں فیصلہ کر کے
اور ملک کو کانگریس کے حوالے کر کے چلے جائیں۔ اسی موقع پر قائداعظمؒ نے بہادر یار جنگ
سے یہ بھی فرمایا۔ کہ اگرچہ انہوں نے ایک سال قبل لیگ سے چندے کی اپیل کی تھی لیکن
اب تک اس کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا ہے۔ اور مسلم لیگ کی مالی حالت کچھ زیادہ خوشگوار نہیں۔

تھیں جب سے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس وقت مسلم لیگ کالج کے عام جلسے میں نواب بہادر یار جنگ نے آیات کریمہ سے اپنی تقریر کا آغاز کیا تھا جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں اور مومنین کی جان و مال کو جنت کے معاوضے میں خرید لیا ہے" یہ تقریر ۲ یا ۳ گھنٹے جاری رہی ایسی پُر اثر اور پُر سوز تھی کہ لوگ پروانہ وار مسلم لیگ پر نثار ہونے لگے۔ اور جلسہ برخاست ہونے سے قبل ہی قائد اعظمؒ کی مقرر کردہ حد سے کہیں زیادہ رقم وصول ہو گئی۔ اس موقع پر نواب بہادر یار جنگ نے مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والے پاکستان کی ایسی واضح نشاندہی کی تھی کہ خود قائد اعظمؒ نے اس پر مہر تصدیق ثبت فرما دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو اور غیر مسلم پریس اور خود انگریز یہ کہہ رہے تھے کہ پاکستان کیا ہے؟ یہ بات خود قائد اعظمؒ کے ذہن میں بھی نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ نواب بہادر یار جنگ نے اپنی اس تقریر میں پاکستان کے تصور کو موضوع بنایا تھا۔ اور واشگاف الفاظ میں اس کی تشریح کی تھی کہ پاکستان کیا اور کیسا ہو گا؟

قائد اعظمؒ نے بہادر یار جنگ کی تشریح کو صحیح قرار دیا تھا۔ نواب بہادر یار جنگ نے حاضر جوابی اور برجستگی سے کام لیتے ہوئے میری طرف اشارہ کیا اور کہا کہ یہ میرے دوست ڈاکٹر رضی الدین صاحب لڑکوں کو امتحان سے کئی ہفتے پہلے کامیاب کرتے ہیں اور ڈگری دیتے ہیں۔ لیکن میرا تو بی۔ اے امتحان بھی ہو گیا اور قائد اعظمؒ نے ڈگری بھی عطا فرمادی۔

حیدر آباد دکن میں قائد اعظمؒ سے دو مرتبہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ایک دفعہ جامعہ عثمانیہ کے طلباء کی طرف سے قائد اعظمؒ کے اعزاز میں عشائیہ کے موقع پر جس میں قائد اعظمؒ نے مسلمانان ہند کے لیے ایک آزاد اور خود مختار مملکت پاکستان کے قیام کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کیا تھا۔ اور دوسری دفعہ ۱۹۴۴ء میں نواب بہادر یار جنگ کی ناگہانی وفات کے بعد جب قائد اعظمؒ حیدر آباد دکن تشریف لائے تھے ان سے مرحوم نواب بہادر یار جنگ کے متعلق گفتگو ہوئی تھی۔ اس کے بعد مجھے پھر قائد اعظمؒ سے ملنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ لیکن ان کے قیام حیدر آباد ہی کا ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔

لکھنؤ میں مسلمانوں کے دو فرقوں کے درمیان ایک تنازعہ میں مصالحت کا سوال آگیا

حیدرآباد کے ایک امیر کبیر نے ایک فریق کی طرف سے قائداعظمؒ کو وکیل مقرر کرنے کی
خواہش ظاہر کی، اور پانچ لاکھ روپیہ بطور معاوضہ پیش کیا۔ لیکن قائداعظمؒ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا
کہ وہ مسلمانوں کے فرقوں کے درمیان کسی بھی ایک کی طرف داری کرنا نہیں چاہتے اور کسی
ایک کی طرف سے پیروی کرنے کو پسند نہیں کرتے۔ آج سے چالیس سال قبل پانچ لاکھ
روپے کی حقیقت بہت قدر زیادہ تھی۔ قائداعظمؒ نے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کی خاطر کیا کیا قربانیاں
دیں اس کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے۔

قیام پاکستان سے پانچ سال قبل قائداعظمؒ نے ایک تعلیمی کمیشن مقرر کیا تھا جس کا ایک
رکن میں بھی تھا۔ اس کمیشن نے برصغیر کے مسلمانوں میں تعلیم اور سائنس کو فروغ دینے کے لیے
ایک تفصیلی رپورٹ تیار کی تھی جس میں اور تجویزوں کے علاوہ سندھ اور پشاور میں یونیورسٹیوں
کے قیام کی تجویزیں بھی شامل تھیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ بعد میں خود مجھ ہی کو دونوں یونیورسٹیوں
کی تعمیر و تشکیل میں بطور وائس چانسلر کے کام کرنا پڑا۔ ان کی وفات کے چند سال بعد جب ان
کی جائداد کا فیصلہ ہوا تو ان کی وصیت کے مطابق ان کی جائیداد سے تین علمی اداروں کو ایک تہائی
تقسیم کی گئی۔ یہ ادارے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، اسلامیہ کالج پشاور اور سندھ مسلم مدرسہ تھے
میں پشاور یونیورسٹی کا وائس چانسلر تھا۔ فاطمہ جناح مرحومہ نے مجھے اس کی اطلاع دی اور
اس سلسلے میں ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں اور پھر اس رقم سے پشاور یونیورسٹی میں قائداعظمؒ
ہوسٹل کا قیام عمل میں آیا۔

قائداعظمؒ کے اعتماد، یقین محکم کے سلسلے میں ایک واقعہ جو باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا
یہ ہے کہ جب بنگال اور پنجاب کی تقسیم کی گئی اور آدھا صوبہ بنگال اور آدھا صوبہ پنجاب پاکستان
کے لیے نشان زد کیا گیا تو بعض مسلم اور غیر مسلم رہنماؤں نے قائداعظمؒ سے کہا کہ ایسے پاکستان سے
کیا حاصل ہوگا؟ تو قائداعظمؒ نے اپنے قلم سے سیاہی کی ایک بوند کاغذ پر گرائی اور کہا کہ یہ جان
لیجئے کہ اگر مجھے اس بوند کے برابر بھی پاکستان مل گیا تو میں اسے قبول کر لوں گا۔ اس واقعہ
سے معلوم ہوتا ہے کہ قائداعظمؒ نے پاکستان کی ضرورت اور اہمیت کو کس قدر سمجھا تھا اور
مسلمانوں کے مجموعی تحفظ اور ان کی بقا کے لیے ان کی نظر میں پاکستان کی کیا افادیت

حق و قوتِ ایمانی اور ذکر و شغل کے متعلق ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ایک مرتبہ حیدرآباد دکن میں نواب بہادر یار جنگ سے میری ملاقات ہوئی تو وہ بے حد گھبرائے ہوئے اور پریشان نظر آئے۔ میں نے سبب دریافت کیا تو انہوں نے کہا تم نے وہ خبر پڑھی۔ ایک خاکسار نے قائدِ اعظم پر حملہ کیا ہے اور وہ زخمی ہو گئے ہیں اور میں ابھی بمبئی جا رہا ہوں۔ چنانچہ وہ بمبئی گئے اور جب واپس آئے تو انہوں نے کہا یہ صرف مومن کا کرشمہ تھا کہ قائدِ اعظم کمزور اور نازک انسان ہیں مگر اس شخص سے جو جوان تھا کس کر اور اس کے خنجر کو پکڑ لیا۔ اور ایک سیکنڈ میں ہی کر کے اس کا وار ناکام بنا دیا۔ سوائے قوتِ ایمانی اور یقینِ محکم کے اس کی توجیح اور کیا ہو سکتی ہے۔

سید شریف الدین پیرزادہ

باصلاحیت وکیل

جہاں تک مجھے یاد ہے اپریل ۱۹۴۱ء کا زمانہ تھا، بمبئی میں مسلم لیگ کی وہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت نوابزادہ لیاقت علی خان نے کی تھی۔ میں نے اس زمانے میں ایک پمفلٹ "پاکستان ایک نظر میں" لکھا، جو بڑی تعداد میں کانفرنس کے مندوبین میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یہ پمفلٹ قائد اعظمؒ نے بھی پڑھا، اور مسٹر [illegible] کے ذریعے مجھے بلا کر فرمایا کہ میں ان کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کروں۔ میں نے عرض کیا کہ میں پڑھ رہا ہوں اور کالج نہیں چھوڑ سکتا، لہٰذا جز وقتی سیکرٹری کے فرائض انجام دینا اپنا اعزاز سمجھوں گا۔ قائد اعظمؒ اس پر آمادہ ہو گئے لیکن ان کا اصرار تھا کہ مجھے جز وقتی سیکرٹری کی حیثیت سے بھی تنخواہ بہرحال لینا پڑے گی۔ میں نے عرض کیا کہ میں ان کا ایک ادنیٰ پیروکار ہوں۔ وہ میرے قائد ہیں اور میں اپنے قائد سے تنخواہ لینے کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ یہ سن کر انہوں نے غصہ کے انداز میں جواب دیا: "اس صورت میں مجھے تمہاری خدمات کی ضرورت نہیں ہے۔" میں سمجھا شاید یہ بات ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر انہوں نے فرمایا: "خیر اگر تم تنخواہ لینا نہیں چاہتے تو اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ تم اعزازی طور پر اپنا کام جاری رکھ سکتے ہو۔" اس طرح ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۴ء تک میں ان کے سیکرٹری کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ اس زمانے میں میرا زیادہ تر کام یہ تھا کہ مختلف اخبارات و رسائل دیکھ کر ان سے اقتباسات اور مضامین کاٹ کر فائل میں رکھوں۔ ان کے خلاصے تیار کروں۔ ہندوستانی

سیاست پر مضامین اور غیر ملکی مصنفین کی تازہ کتابوں کا مطالعہ کروں، ان کا خلاصہ تیار کروں، قائد اعظمؒ کے تمام بیانات جو وہ وقتاً فوقتاً جاری کرتے رہتے تھے، کی ایک مکمل فہرست بناؤں۔ کانگریسی لیڈروں اور ہندو رہنماؤں کے بیانات کے تراشے بھی میرے پاس تیار رہتے تاکہ قائد اعظمؒ کو کسی حوالے کی ضرورت پڑے تو وہ فوراً حاضر کر دیا جائے۔ اس طرح قائد سے میری ذاتی وابستگی کا آغاز ہوا۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب مجھے ان کی قربت کا اعزاز حاصل ہوا۔ درحقیقت ہر واقعہ جو کسی نہ کسی شکل میں قائد اعظمؒ سے منسوب ہے بجائے خود بہت اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن اس وقت میں ان سارے واقعات کو بیان کروں تو بہت وقت درکار ہوگا۔ اس لیے میں یہاں صرف دو واقعات کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔

پہلا واقعہ شاید ۲۲ جولائی ۱۹۴۳ء کا ہے جب رفیق صابر نے قائد اعظمؒ کی جان لینے کی کوشش کی۔ میں عموماً قائد اعظمؒ کے پاس دس اور ڈھائی بجے کے درمیان جاتا تھا لیکن اس دن میں کوئی نصف گھنٹہ دیر سے پہنچا۔ حملہ ڈیڑھ بجے کے قریب ہوا اور مجھے اس واقعہ کا علم نہیں تھا۔ چنانچہ میں سیدھا اوپر چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بہت اطمینان سے اپنی خواب گاہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے پولیس کو ہدایت کی تھی کہ ان کے حملہ آور سے الگ ہٹ کر پوچھ گچھ کی جائے۔ لیکن یہ تحقیقات ان کی موجودگی میں نہ ہو۔ انہوں نے سب سے پہلے یہ کیا کہ ایک بیان جاری کیا جس میں بتایا گیا تھا کہ رفیق صابر نامی ایک شخص نے انہیں قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ ہندوستان بھر میں عوام کو یہ معلوم ہو جائے کہ کسی ہندو نے ان کی زندگی پر حملہ نہیں کیا تھا۔ ورنہ اس خبر کے عام ہوتے ہی فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

اسی دوران ایک اور اہم واقعہ پیش آیا۔ قائد اعظمؒ کو پہلی بار اپنی بیٹی کا خط ملا جس میں اس نے ملاقات کی خواہش کی تھی۔ شاید ۱۹۴۰ء میں اپنی شادی کے بعد اس نے قائد اعظمؒ کو پہلی مرتبہ خط لکھا تھا۔ اسے یہ قاتلانہ حملے کی خبر سن کر بیٹی کا پریشان ہونا ایک فطری بات تھی۔ قائد اعظمؒ نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد

وہ خود آگئیں اور سیدھی ڈرائنگ روم میں چلی گئیں جہاں قائداعظم بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سے کچھ باتیں کیں۔ چونکہ ہم دور بیٹھے تھے لہٰذا کچھ نہ سن سکے۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ قائداعظم بالکل خاموش بیٹھے رہے اور انہوں نے بیٹی کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تقریباً دس منٹ تک اس انتظار میں بیٹھی رہیں کہ شاید کوئی جواب ملے لیکن انہیں یکسر خاموش دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سنا ہے ۱۹۴۹ء میں ایک امریکن جرنلسٹ مس مارگریٹ برک نے درمیان میں پڑ کر قائداعظمؒ اور ان کی صاحبزادی میں صلح صفائی کرادی تھی مگر یہ تعلقات بھی زیادہ عرصہ باقی نہ رہے۔

حملے کے دو چار دن بعد کا ایک اور اہم واقعہ سنیے۔ بہت سے لوگ بڑی تعداد میں انہیں ملنے اور عیادت کے لیے آنا چاہتے تھے۔ لیکن ڈاکٹروں اور پولیس نے منع کردیا تھا کہ ان سے ملنے کی کسی کو اجازت نہ دی جائے۔ یوں بھی انہیں آرام کی سخت ضرورت تھی اور ساتھ ہی احتیاط اور تحفظ کا بھی یہی تقاضا تھا۔ نواب بہادر یار جنگ نے جب یہ خبر سنی تو وہ قائداعظمؒ کو مطلع کیے بغیر عیادت کے لیے حیدرآباد (دکن) سے چل پڑے۔ اور بمبئی پہنچ گئے۔ وہ اسٹیشن سے سیدھے قائداعظمؒ کی رہائش گاہ پر تشریف لے گئے اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ مس فاطمہ جناح نے جواب دیا کہ اس سلسلے میں بہت سخت ہدایات ہیں اس لیے آپ قائداعظمؒ سے نہیں مل سکتے۔" نواب بہادر یار جنگ نے فرمایا: "قائداعظمؒ سے ملاقات کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ میں ان کے پاس جاؤں گا اور گفتگو کروں گا بلکہ میں صرف دور سے ان کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے مس فاطمہ جناح سے کہا: "براہ کرم مجھے اوپر جانے دیجیے۔ میں صرف دیکھ کر چلا آؤں گا۔" لیکن مس فاطمہ جناح نہ مانیں اور نواب بہادر یار جنگ واپس ہو کر حیدرآباد چلے گئے۔

چند دن گزرنے کے بعد ہم نے قائداعظمؒ سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ انہیں یہ سن کر بے حد افسوس ہوا اور فرمایا: "ڈاکٹروں کی ہدایت بجا سہی لیکن ان کا اطلاق لیڈروں اور نواب بہادر یار جنگ جیسے افراد پر کس طرح ہو سکتا ہے؟" چنانچہ انہوں نے نواب بہادر یار جنگ کو انتہائی شائستہ لہجے میں لکھا اور دعوت دی کہ وہ دوبارہ بمبئی آ کر ان سے

لی ہیں اور ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ نواب بہادر یار جنگ خط ملتے ہی بمبئی پہنچے اور قائد کے ساتھ کھانا کھایا۔ شاید آپ کو اس واقعہ میں کوئی عجیب بات نظر آئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قائد اعظمؒ شاذ و نادر ہی کسی کو دوپہر یا شام کے کھانے پر مدعو کرتے تھے۔ قائد اعظمؒ کے ساتھ کھانے کا یہ اعزاز میری موجودگی میں صرف نواب بہادر یار جنگ کو نصیب ہوا۔ چلتے وقت نواب بہادر یار جنگ نے کہا: "قائد اعظمؒ! آج جمعہ ہے لیکن اس کے باوجود میں تعمیل حکم میں حاضر ہو گیا ہوں۔ میں کبھی بھی جمعہ کی نماز قضا نہیں کرتا۔ لیکن شاید اللہ مجھے یہاں معافی مل جائے کیونکہ میں بمبئی میں مسافر ہوں۔" قائد اعظمؒ نے فرمایا۔ "نہیں آپ جمعہ کی نماز قضا نہیں کریں گے۔ مسجد یہاں سے قریب ہے۔ جا کر نماز ادا کیجیے۔ باقی ہم بعد میں کر لیں گے۔"

اسی دوران ایک اور واقعہ پیش آیا۔ رفیق صابر کے خلاف اقدام قتل کا مقدمہ بمبئی ہائی کورٹ کے جسٹس بلیک ویل کے زیر سماعت تھا۔ حکومت نے مقدمہ کی پیروی کے لیے ایک خصوصی پراسیکیوٹر مقرر کر دیا۔ اس وقت پبلک پراسیکیوٹر مشہور مسلم وکیل مسٹر کے ایم سوم جی تھے جنہوں نے [illegible] قتل کے مقدمہ کی پیروی کی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مقدمہ میں بڑی تعداد میں مسلمانوں کو قتل کا مرتکب ٹھہرایا گیا تھا۔ لیکن ہائی کورٹ نے ان سب کو رہا کر دیا تھا۔ مسلمانوں کی جانب سے مقدمہ کی پیروی مسٹر سوم جی نے کی تھی۔ چنانچہ سوم جی جب قائد اعظمؒ سے ملاقات کے لیے گئے اور مقدمہ کے سلسلے میں کچھ بات کرنا چاہی تو قائد اعظمؒ نے فرمایا: "اگر تم مجھ سے اس مقدمہ کے سلسلے میں ملنے آئے ہو تو آخر میں سمجھ لو کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ مجھ سے جو سوال کرنا ہے وہ عدالت میں کرنا۔ یہاں اس مسئلے پر کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی۔" اس کے بعد مسٹر سوم جی نے وہ سیکڑوں خطوط دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جن میں قائد اعظمؒ کو جان سے مار دینے کی دھمکیاں دی گئی تھیں۔ قائد اعظمؒ نے فرمایا کہ "ہاں تم یہ خطوط ضرور دیکھ سکتے ہو۔" پھر مجھے حکم دیا کہ میں مسٹر سوم جی کو وہ تمام خطوط دکھا دوں لیکن اصل خطوط ان کے سپرد نہ کروں۔ اگر وہ ان خطوط سے کچھ نقلیں اور اقتباسات لینا چاہتے ہیں تو وہ انہیں لے لینے دیے جائیں

کیونکہ وہ سب عدالت میں پیش کیے جائیں گے۔ ہوا بھی یہی کہ یہ تمام خطوط عدالت میں داخل کر دیئے گئے۔

مقدمہ شروع ہوا تو چیف جسٹس سٹون نے قائداعظمؒ کو پیغام بھیجا کہ جب وہ عدالت میں تشریف لائیں تو ان کا استقبال کیا جائے گا۔ اور وہ اس دروازے سے عدالت میں داخل ہوں جو صرف جج صاحبان کے لیے مخصوص ہے۔ نیز مقدمہ کی کارروائی شروع ہونے تک وہ چیف جسٹس کے چیمبر میں تشریف رکھ سکتے ہیں۔ "قائدؒ نے جسٹس اسٹون کی اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ عدالت میں وہ ایک گواہ کی حیثیت سے آ رہے ہیں اور اسی دروازے سے داخل ہوں گے جس سے دوسرے لوگ آتے جاتے ہیں اور وہیں کرسی پر بیٹھیں گے جہاں گواہوں کو بٹھایا جاتا ہے۔"

مقدمہ کے دوران قائداعظمؒ سے ہر قسم کے غیر ذمہ دارانہ سوالات پوچھے گئے۔ جسٹس بلیک ڈین نے کوشش کی کہ اس قسم کے سوالات پوچھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ لیکن قائداعظمؒ نے مداخلت کرتے ہوئے فرمایا۔ "وکیل صفائی کو جرح کرنے کا پورا حق حاصل ہے اور وہ اس حق کو تسلیم کرتے ہیں۔" مقدمہ کی کارروائی ختم ہونے کے بعد جسٹس بلیک ڈین نے قائداعظمؒ کی گواہی کی بے حد تعریف کی۔ بلکہ انہوں نے اپنے فیصلہ میں یہ جملہ لکھا کہ اپنی طویل عدالتی زندگی میں انہوں نے مسٹر جناح جیسا سچا گواہ آج تک نہیں دیکھا۔

اب ذرا بیورلے نکلس سے قائداعظمؒ کی ملاقات کا حال بھی سنتے چلیے۔ ہوا یوں کہ جب مسٹر نکلس نے انٹرویو کے لیے وقت مانگا تو انہوں نے خود کو ایک برطانوی اخبار کا نمائندہ بتایا تھا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ انٹرویو کو اپنے اخبار میں شائع کرنا پسند کریں گے۔ قائداعظمؒ نے انہیں ایک طویل اور بہت تفصیلی انٹرویو دیا۔ اور اس میں پوری طرح پاکستان سکیم اور تحریک پاکستان واضح کر دی۔ لیکن قائداعظمؒ کا اصرار تھا کہ شائع ہونے سے پہلے انٹرویو کی نقل انہیں دکھا دی جائے تاکہ وہ اسے درست کر کے انہیں واپس کر دیں۔ اس کے بعد انٹرویو کی اشاعت کی اجازت دی جا سکے گی

چنانچہ دوسرے دن قائداعظمؒ نے مسٹر بیورے نکلس کا مسودہ درست کر کے انہیں واپس کر دیا۔ بعد میں مسٹر نکلس نے قائداعظمؒ کو لکھا کہ انٹرویو اتنا اچھا ہو گیا ہے کہ اسے اپنے اخبار میں شائع کرنے کے بجائے وہ ایک علیحدہ کتاب کی شکل میں چھاپنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ قائداعظمؒ نے انہیں جواب میں لکھا کہ اگر انہیں پہلے سے یہ بات معلوم ہوتی تو شاید وہ یہ انٹرویو نہ دیتے۔ لیکن جب یہ کتاب "ورڈکٹ آن انڈیا" کے نام سے شائع ہوئی تو قائداعظمؒ نے کہا کہ وہ کتاب سے اس حد تک متاثر ہوئے ہیں کہ انہیں یہ بات کہتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ نکلس نے غیر جانبدارانہ فیصلہ دیا ہے۔ اور اس طرح انہوں نے مسٹر بیورے نکلس کی پہلی فروگزاشت کو فراموش کر دیا۔

قائداعظمؒ ایک باصلاحیت اور نہایت ہی قابل بیرسٹر تھے۔ وہ فوجداری اور دیوانی دونوں قسم کے مقدمے لیتے تھے۔ جرائم کے ان مقدمات کے بارے میں کسی قسم کی تفصیلات میں جانے کی اس وجہ سے ضرورت نہیں ہے کہ ان کا ذکر اخبارات اور رسائل میں شائع ہو چکا ہے۔ صرف ایک باؤلا قتل کیس کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا جس میں بہت سے وہ افراد ملوث تھے جو اس وقت کے مہاراجہ اندور کے ساتھ تھے۔ قائداعظمؒ نے دو مرتبہ تلک کا مقدمہ لڑا اور ۱۹۱۶ء میں انہیں رہا کرایا۔ اس مقدمہ میں قائداعظمؒ نے بمبئی ہائی کورٹ کی فل بنچ کے روبرو بغاوت کے قانون پر بہت تفصیلی بحث کی تھی۔

انہوں نے بہت سے دیوانی مقدمات کی بھی پیروی کی۔ جن میں مختلف صوبوں کی ہائی کورٹوں کے علاوہ انگلستان کی پریوی کونسل کے ممتاز ججوں نے ان کی قانونی لیاقت اور قابلیت کی بارہا تعریف اور مقدموں کی کامیاب پیروی پر داد دی۔

قائداعظمؒ اپنا کیس نہایت سلیقے سے پیش کرتے تھے۔ وہ جرح اور بحث دونوں میں مہارت رکھتے تھے اور جرح میں تو ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ باؤلا کے مقدمہ

حق میں انہوں نے اس طرح جرح کی کہ اس زمانے کے دو بہترین جرح کرنے والے وکیلوں مسٹر وڈنگر اور مسٹر گیبک نے بھی قائد اعظمؒ کی بے حد تعریف کی۔ وہ جب جیوری کے سامنے اپنا کیس پیش کرتے تھے تو ان کا لاثانی جواب ہوتا تھا۔ مسٹر چھاگلہ کہا کرتے تھے کہ جہاں تک بحث کرنے کا تعلق ہے اس فن میں قائد اعظمؒ کا کوئی حریف نہیں۔ البتہ اس بات میں اختلاف کیا جا سکتا ہے کہ وہ پورے قانون پر کس حد تک حاوی تھے۔ لیکن میں نے بھی قائد اعظمؒ کو بے حد قریب سے دیکھا ہے اور میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک کرمنل لاء یا آئینی قانون دانی کا سوال ہے ان کا مطالعہ ان دونوں شعبوں میں تھا۔ اور وہ دونوں شعبوں پر بے حد حاوی تھے۔ مسٹر چھاگلہ جو بمبئی ہائیکورٹ کے چیف جسٹس اور بعد ازاں ہندوستان کے وزیر خارجہ بھی ہوئے ابتداء میں قائد اعظمؒ کے بہت قریب تھے۔

قائد اعظمؒ کام کرنے میں اصول اور ضابطہ کے بہت پابند تھے۔ وہ ہر کام بالکل صحیح وقت پر انجام دیتے تھے۔ بالکل مشین کی طرح ٹھیک ساڑھے نو بجے وہ اپنے مطالعہ کے کمرے میں داخل ہوتے اور بمبئی کے تمام روزنامے اچھی طرح پڑھتے تھے۔ "ہندو" "اسٹیٹسمین" اور کبھی کبھار مقامی اخبارات کا مطالعہ بھی کیا کرتے۔ پھر جو ڈاک رسالے اور اخبارات الگ ہوتے جو وہ عموماً رات کے وقت یا پھر صبح سویرے دیکھا کرتے پھر ڈاک دیکھتے تھے، خطوط کے جوابات لکھواتے تھے۔ دس ساڑھے دس بجے تک ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ اور تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا درمیان میں کبھی کبھی چائے کا ایک کپ پی لیتے تھے۔ اس کے بعد انٹرویو کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا تھا جو لنچ تک جاری رہتا تھا اور لنچ بھی روزانہ مقررہ وقت پر ہی ہوتا تھا۔ اگر مس جناح موجود ہوتیں تو وہ بھی لنچ میں شریک ہو جاتی تھیں ورنہ قائد اعظمؒ تنہا لنچ کرتے تھے۔ پھر وہ تھوڑی دیر آرام کرتے اور جلد ہی دوبارہ کام شروع کر دیتے۔

قائد اعظمؒ نے اسلامی تاریخ کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے [illegible]

کی تقریباً ساری کتابیں پڑھی تھیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی حدیثیں بیان کرتے تھے۔ مولانا ظفر علی خان مرحوم نے علامہ شبلی کی الفاروق کا انگریزی ترجمہ قائداعظمؒ کی نذر کیا تھا۔ جب قائداعظمؒ نے یہ کتاب پڑھی اور حضرت عمر فاروقؓ کے حسن انتظام اور نظم و نسق کے بارے میں پڑھا تو وہ اس سے بے حد متاثر ہوئے وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ہمیں حضرت عمرؓ کی تقلید کرنا چاہیئے۔ سیاسی طور پر وہ اتاترک سے بہت متاثر تھے اور بار بار فرمایا کرتے تھے کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے کمال اتاترک کا کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اتاترک سے متاثر تھے مگر جہاں تک انتظامی معاملات کا تعلق ہے وہ حضرت عمرؓ کے نقش قدم پر چلنا چاہتے تھے۔ قائداعظمؒ نے ہمیشہ کہا کہ قرآن ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اور جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے وہ ایک اسلامی ریاست ہوگی۔ انہوں نے یہ بات نہ صرف مولانا شبیر احمد عثمانی سے کہی بلکہ پیر مانکی شریف کو اس سلسلے میں اپنی جانب سے ایک تحریری عہد نامہ بھی لکھ کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں جب غیر ملکی مسلم صحافی ان سے ملنے آئے تھے تو انہوں نے واضح الفاظ میں ان سے کہا تھا کہ پاکستان عملی طور پر ایک اسلامی ریاست ہوگی۔

ایلن کیمبل جانسن

حصول پاکستان کی حکمت عملی

مجھے قائداعظم کو پہلی بار ۱۹۴۶ء میں مرکزی قانون ساز اسمبلی کے اجلاس میں دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس وقت میں ساؤتھ ایسٹ ایشیا کمانڈ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے عملے میں شامل تھا۔ میں اسمبلی کے اس اجلاس کی کارروائی دیکھنے گیا تھا۔ جس میں بنگال کے قحط پر بحث ہو رہی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے قائداعظم کی تقریر بہت انہماک سے سنی تھی۔ محکمہ خوراک نے قحط سے نمٹنے کے جو طریقے اختیار کئے تھے وہ ان پر کڑی تنقید کر رہے تھے۔ ان کی تقریر سن کر میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ زبردست منطقی ذہن رکھتے تھے اور اہم قومی مسائل پر بھرپور انداز میں اپنے خیالات کا اظہار فرماتے تھے۔

بعد ازاں جب میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا پریس اتاشی مقرر ہوا اور دلی آ گیا تو دوسرے معاملات کے علاوہ پریس تعلقات کے بارے میں خاص طور سے گفتگو کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ معاملات ان کی قیام گاہ پر ہوئے۔ میرا پہلا تاثر ان کے گھر کے بارے میں تھا جس کا ذکر میں نے اپنی کتاب میں بھی کیا ہے اور ان کی رہائش گاہ کو میں نے مسجد سے تشبیہ دی ہے۔ میرے دماغ میں یہ خیال ان کے گھر کی پرسکون فضا اور پاکیزہ ماحول دیکھ کر پیدا ہوا تھا۔ مجھے اس مکان کی سادگی نے بے حد متاثر کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ جگہ اتنی پرسکون ہے کہ آدمی کسی خلل کے بغیر غور و فکر کر سکتا ہے۔

جناح کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ وہ بہت ہی باوقار، متین اور آہنی

شخصیت کے ملک میں انھیں اس کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ اپنی عظمت منوانے
کے لئے اپنی آواز میں للکار پیدا کریں۔ وہ فرشتوں کا روپ رکھتے تھے اور عزم اور
ارادے کے بہت پکے تھے۔

آخری مرتبہ میں ان سے پاکستان کے قیام کے دن ۱۴ اگست کو ملا تھا۔ اس
موقع پر ان کی تقریر سنی۔ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہمراہ تھا۔ ان کے چہرے
سے پُرغرور خود اعتمادی نمایاں تھی، ایک شان بے نیازی، ایک بلندی، ایک فاصلہ!
ایک ایسا قائد جو الگ تھلگ رہتے ہوئے بھی سیاست و معاملات پر پوری طرح حاوی تھا۔
میں نے یہ الفاظ ان معنوں میں استعمال کئے ہیں جن کا ان کی شخصیت پر بالکل صحیح
اطلاق ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسے فرد تھے جو انتہائی دشوار مقصد حاصل کرنے کا عزم رکھتے
تھے۔ اور یہ مقصد ایسا نہیں تھا جس کے حصول میں وہ خاطر داریوں اور روایتی نیاز مندیوں
سے کام لیا جاتا جو قریبی انسانی تعلقات کا تقاضا سمجھی جاتی ہیں بلکہ یہ ایسا کام تھا جس میں
یا تو مکمل کامیابی ہو سکتی تھی یا مکمل ناکامی۔ اسی لیے ان کو وہ سب کچھ کرنا پڑا جو اس مقصد
کو حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا۔

قائداعظم اور ماؤنٹ بیٹن

اس زمانے میں ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کی گئیں مثلاً یہ کہ وہ بہت
کم آمیز اور سخت طبع تھے۔ ماؤنٹ بیٹن کا خیال بھی یہی تھا۔ اصل میں یہ تمام باتیں غلط تھیں۔
امر واقعہ یہ ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور مسٹر جناح شروع ہی سے ایک دوسرے کو اچھا
سمجھتے تھے۔ ایک دوسرے کی بہت عزت و توقیر کرتے تھے۔ ایک دوسرے
کی اعلیٰ صلاحیتوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نکتہ کو ذہن میں رکھنا
از بس ضروری ہے۔ بعض تاریخی واقعات کی گفتگو کے سلسلے میں کچھ گڑبڑی پیدا ہوگئی جس سے
یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ دونوں ایک دوسرے کا احترام نہیں کرتے تھے۔

قائداعظم اور ڈیگال

میں اکثر اس خیال کا اظہار کر چکا ہوں کہ ممتاز عالمی شخصیتوں سے قائداعظم کا موازنہ
کیا جائے تو ڈیگال اور قائداعظم میں بہت زیادہ مماثلت تھی۔ دونوں کے اندازِ فکر میں
بہت یکسانیت پائی جاتی تھی اور دونوں کو ایک ہی قسم کے مسئلے سے نمٹنا تھا۔ عجیب
اتفاق ہے کہ دونوں نے ۱۹۴۰ء ہی کے آس پاس تاریخ ساز فیصلہ کیا۔ ڈیگال اپنی قوم
کے تن مردہ میں نئی روح ڈالنے کا عزم لے کر اٹھے اور جناح نے ایک نئی قوم کی تخلیق
کا بیڑا اٹھایا۔ دونوں کی ذات اور قوت ارادی نے قوم کا قالب اختیار کیا۔ اتنے بڑے
کام کے لیے بے پناہ عزم اور بھرپور قائدانہ صلاحیت درکار تھی۔ دونوں کو ایک
پر آشوب صورتحال کا سامنا تھا۔ تاش کی اصطلاح میں یہ بات یوں کہی جا سکتی ہے
کہ ان کے ہاتھ میں جیتنے والے پتے نہ ہونے کے برابر تھے لیکن دونوں کے ہاتھ میں
ایک ایک پتہ ایسا ضرور تھا جو پٹنے والا تھا ہی نہیں۔

ڈیگال اور جناح دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کا معاملہ ایسے لوگوں سے
ہے جو بالآخر رضامندی سے کسی سمجھوتے پر پہنچنے کی بجائے دور ہی ہیں۔ فرانس
میں کسی ایسے نظام کو رائج کرنا محال تھا۔ جو اتحادی طاقتوں اور فرانسیسی عوام کے لئے
قابل قبول نہ ہو۔ اسی طرح ہندوستان میں اس وقت تک کوئی تصفیہ نہیں ہو سکتا تھا۔
جب تک کہ تمام متعلقہ جماعتیں اس پر متفق نہ ہوں۔ ڈیگال اور جناح اچھی طرح جانتے تھے
کہ کمزوری کہاں ہے۔ اور وہ تھا دوسرے فریق کی رضامندی کا مسئلہ جب وہ خود
نہیں کر دیتے تھے تو انکار کے بعد کوئی معاملہ طے ہو ہی نہیں سکتا تھا اور یہی ان کا
سب سے بڑا حربہ تھا۔ لہٰذا صحیح صورتحال سے مطالعہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ
ان کو پہلے سے راضی کیا جائے۔ ان دونوں کی تاریخی جدوجہد پر نظر ڈالنے سے
یہ بات واضح ہو جائے گی کہ دونوں میں بہت مماثلت موجود تھی۔

۳ جون کا منصوبہ

۳ جون کے منصوبے کے سلسلے میں ماؤنٹ بیٹن کو یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ جناح صاحب تقسیم ہند کے منصوبے کو قبول کریں گے یا نہیں۔ نیز کانگریس ان کو ایک فریق ماننے پر تیار ہوگی یا نہیں۔ وہ ہر شق تجویز کردہ کرتے رہے جو جناح کی خواہشات اور مطالبات کے مطابق نہیں تھی اور جب منصوبہ کی اصل میں ایک بین بین دستاویز تھی جس میں کسی فریق کے بھی تمام مطالبات تسلیم نہیں کیے گئے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن کو اس بات کی بہت تشویش تھی کہ اس منصوبے کے سلسلے میں شاید جناح سر ہلا کر بھی اپنی منظوری کا اظہار نہیں کریں گے چنانچہ اس ضمن میں دونوں میں وہ مشہور ملاقات بھی ہوئی تھی جس میں ماؤنٹ بیٹن نے ان سے کہا تھا کہ اگر آپ قطعی طور پر "نہیں" نہیں کہیں گے تو میں اس کا مطلب یہ لوں گا کہ آپ کو یہ تجویز منظور ہے۔

یہ پہلا موقع تھا جب میں نے ماؤنٹ بیٹن کو جناح صاحب سے ملاقات سے پہلے بہت فکرمند پایا اور یہ بات بڑی اہم تھی کیونکہ جون منصوبے کو حتمی طور پر تسلیم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ جناح صاحب اپنے سابق موقف سے ہٹیں۔ یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کا بہت احترام کرتے تھے لیکن کہا جاتا ہے کہ پہلے دن ہی سے ان کی بنتی نہیں تھی اور لوگوں کا خیال ہے کہ شاید دونوں ایک دوسرے کو ناپسند کرتے تھے لیکن ایسا نہیں۔ صورت حال ہی تنازعہ فیہ تھی میرا خیال ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کی بھی خواہش تھی کہ ایسا حل مل جائے جو متحدہ ہندوستان کا ضامن ہو اور میں سمجھتا ہوں کہ برطانیہ کی جگہ جو بھی ہوتا وہ بھی اقتدار متحدہ ہندوستان ہی کو منتقل کرتا کیونکہ ہم تو صرف ایک متحدہ مملکت چاہتے تھے اس اعتبار سے ہندوستان کا تقسیم ہونا ہماری نظروں میں ایک تاریخی المیہ تھا مگر جناح صاحب کے نزدیک صورت حال اس کے بالکل برعکس تھی وہ ایک الگ مسلم مملکت کا قیام چاہتے تھے اور یہی تھا وہ تضاد جو اس مسئلہ کا محور تھا مگر انداز فکر کے اس فرق کے باعث وہ ایک دوسرے

سے بدل نہیں تھے ۔ ماؤنٹ بیٹن خلوص نیت سے اس خیال کے حامی تھے کہ اگر
ہندوستان کو تقسیم ہی ہونا ہے تو پاکستان کا قیام بحسن و خوبی ہو۔ بالآخر جب تقسیم
اس مسئلے کا حل قرار پائی تو ماؤنٹ بیٹن نے ثابت قدمی سے کوشش کی کہ تقسیم ملک
ممکنہ حد تک منصفانہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں اختلاف کو خواہ مخواہ بہت
زیادہ ہی اچھالا گیا۔ مثلاً ماؤنٹ بیٹن کے دونوں مملکتوں کے گورنر جنرل بننے کے
معاملے کو لیجئے۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ یہ تجویز خود ماؤنٹ بیٹن نے
پیش کی تھی۔ کچھ اور لوگوں کا کہنا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن اس بات سے سخت پریشان
تھے کہ جناح صاحب ان کی یہ تجویز ماننے پر راضی نہ تھے۔ بلکہ وہ خود ہی آغاز
پاکستان سے اس کے گورنر جنرل ہونا چاہتے تھے۔ میں نہیں مانتا کہ یہ کوئی بہت
[illegible] تھا۔ میرے خیال میں ماؤنٹ بیٹن کا مقصد و نظریہ تھا کہ عبوری مدت کے
لیے دونوں ملکوں کے گورنر جنرل ہونے کے سبب وہ ثالثی کے فرائض انجام دے
سکیں گے۔ جس سے نئی مملکت پاکستان کو فائدہ پہنچ سکے گا۔ مسٹر جناح صاحب اس
خیال کے حامی نہیں تھے جس کی کچھ نہ کچھ وجوہ ضرور ہوں گی جن کا ہمیں علم نہیں۔ میری
رائے یہ ہے کہ وہ اس ملک کی اولین قیادت سنبھالنے میں بالکل حق بجانب تھے۔
جو انہوں نے بے مثال عزم و حوصلہ سے حاصل کیا تھا۔ اور ضرورت بھی اسی چیز
ہی کی تھی کہ شروع ہی سے وہ منصبی اور عملی دونوں طور سے اپنے ملک کی باگ ڈور
اپنے ہاتھ میں رکھتے۔ میں بتا چکا ہوں کہ صورت حال ہی ایسی تھی کہ ماؤنٹ بیٹن
اور جناح صاحب کے درمیان تصادم کا خطرہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ جواہر لال نہرو
کا معاملہ اس سے بہت مختلف تھا۔ وہ نہ صرف وائسرائے کی کونسل کے عہدے
بلکہ سرکاری مشینری کا ایک اہم پرزہ بھی تھے۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ عبوری
حکومت ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک وائسرائے کی کونسل ہی کے ہاتھ میں تھی۔
مسٹر جناح اس کے رکن تھے اور نہ مسٹر گاندھی! اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسٹر جناح
اور ماؤنٹ بیٹن برابر کی حیثیت رکھتے تھے۔ [illegible] سے اگست ۱۹۴۷ء تک نہرو اور

لیاقت علی خان بھی اس کونسل کے رکن تھے۔ البتہ لیاقت، مسٹر جناح کے مقابلے میں
ماؤنٹ بیٹن سے زیادہ قریب تھے۔ اس لیے یہ کہنا کہ ان کی بنتی نہیں تھی صحیح نہیں ؛
بات یہ ہے کہ عجیب و غریب صورت حال سے نمٹنے کے لیے جناح اور ماؤنٹ بیٹن
کے فرض منصبی کا تقاضا ہی کچھ ایسا تھا۔ بڑی حد تک مسٹر گاندھی بھی ماؤنٹ بیٹن سے
تنگ ہی رہتے تھے مسٹر جناح : میرے خیال میں سیاسی اعتبار سے مسٹر جناح
اور ماؤنٹ بیٹن کے درمیان اس نوعیت کے تعلقات ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ جیسے
ماؤنٹ بیٹن اور نہرو یا پٹیل کے درمیان تھے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے
کونسل اور حکومت کے سربراہ تھے اور نہرو اس کے رکن۔ جناح صاحب سے تو ان کو
اقتدار اعلیٰ کی منتقلی کا سوال طے کرنا تھا۔ یعنی مسئلہ یہ تھا کہ نئے تعلقات کی نوعیت کیا
ہونی چاہیئے؟ ظاہر ہے کہ جب اس قسم کا مسئلہ درپیش ہو تو گفت و شنید میں آپ
دوستی کی سی بے تکلفی سے کام لے سکتے ہیں اور نہ وہ تکلف کا انداز اختیار کر سکتے ہیں جو آپ
اپنی کونسل کے کسی رکن سے بات کرتے وقت روا رکھتے ہیں۔ ان کو تو مسٹر جناح سے
کہیں زیادہ اہم اور دور رس معاملات پر اونچی سطح پر بات کرنی پڑتی تھی۔ ایسی صورت
میں بے تکلفی کی گنجائش ہی نہ تھی۔

حصول پاکستان کی حکمت عملی: مسٹر جناح کا مقصد ایک ہی تھا یعنی قیام
پاکستان، جو بالکل واضح تھا اور ہر وقت ان کے سامنے رہتا تھا۔ کوئی طاقت اس سے
ان کی توجہ ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ پاکستان کا قیام ان شرائط و حدود کے مطابق ممکن
نظر نہیں آتا تھا جو انہوں نے لازمی قرار دی تھیں۔ اس لیے ان کو ایک بہت مشکل
فیصلہ یہ کرنا تھا کہ کیا وہ ایک چھوٹی مگر مضبوط ریاست پر قناعت کر لیں یا ایک کمزور
مگر بڑی ریاست کا انتخاب کریں۔ لیکن ایک بار تقسیم کا اصول تسلیم کر لینے کے بعد پنجاب
اور بنگال کی تقسیم کے مسئلے پر سے انحراف بہت مشکل تھا۔ یہ ایک دشوار مرحلہ تھا۔ یہ
بھی حقیقت ہے کہ ان کو وہ سب کچھ نہیں مل رہا تھا جس کا وہ مطالبہ کرتے چلے آئے
تھے۔ اس لیے کہ اقتدار کی منتقلی کا فیصلہ مختلف نظریوں کے مابین ایک سمجھوتے کی حیثیت

رکھتا تھا۔ مگر پھر بھی جیت مسٹر جناح کی ہوئی کہ وہ ایک نئی مملکت کو جنم دینے میں کامیاب
ہو گئے۔ اور انتہائی مخالفتوں کے باوجود کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ حقیقت یہ ہے
کہ چار پانچ برس پہلے پاکستان کے قیام کا امکان یکسر نظر نہ آتا تھا مگر انہوں نے اپنی
منزل کبھی بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دی۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک نئی
مملکت قائم کرنا چاہتے تھے جسے قائم کر کے ہی انہوں نے دم لیا۔

دوسرے رہنماؤں سے موازنہ: ہندوستان کے دوسرے رہنماؤں سے ان کا
موازنہ کرنا آسان نہیں، اس لیے کہ ان سب کے مقاصد جدا تھے۔ کانگریس کے نقطہ نظر سے
اس جماعت کو اس مقام سے نیچے آنا تھا جہاں وہ کیبنٹ مشن منصوبہ کے وقت کھڑی
تھی۔ میری ذاتی رائے ہے کہ اقتدار کی منتقلی کے سلسلے میں جس استقامت کی ضرورت تھی
اس ضمن میں مسٹر جناح کا موازنہ صرف پٹیل سے کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ ایک معنی میں
پٹیل ہی تنہا رہنما تھے۔ جو تقسیم سے پیدا ہونے والے انتظامی امور کا صحیح ادراک رکھتے تھے
اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنی تمام قوت صرف کرنے پر آمادہ تھے۔ نہرو تو تقسیم
کے بعد آشفتہ انداز میں رہے لیکن انتقالِ اقتدار کے دوران پٹیل ہی نے تمام معاملات کا تصفیہ
کیا۔ اور اس کے بعد نوزائیدہ مملکت کا استحکام ممکن تھا۔ دونوں نے یہ کام الگ الگ کیے۔
اگرچہ ان میں دوستی نہیں تھی۔ مگر پٹیل اور نہرو الگ الگ وہ کام کر رہے تھے جو جناح تن تنہا کر
رہے تھے۔

آخری ملاقات: قائداعظم سے میری آخری ملاقات ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء
کو ہوئی۔ اس وقت وہ مجھے مطمئن نظر آ رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے پرستار
انہیں اتنا بلند سمجھتے تھے کہ ان تک رسائی مشکل تھی۔ وہ ایسے شخص نہیں تھے کہ بلا جانے
آپ ان سے ملاقات کر لیں۔ اور جلد بے تکلف ہو جائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے زیادہ
تر پرستار ان کو ایک محترم بزرگ مانتے تھے۔ کیونکہ وہ عمر میں ان سے بہت بڑے تھے
ان میں اور اس دور میں جس کے لیے انہوں نے ایک نیا وطن حاصل کیا کافی بُعد تھا۔ اور
اس اعتبار سے وہ واقعی قوم کے باپ تھے۔ ایک پدرانہ شخصیت اور اسی سبب فاصلہ

کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔

تاریخی کردار: - آخر میں یہ بھی کہوں گا کہ مسٹر جناح بہت بڑے آدمی تھے۔
ان کے ہمعصر ہندوستانی رہنما بھی بڑے لوگ تھے۔ تقسیم ہند کے سلسلے میں جتنی بڑی
شخصیتیں ایک ہی وقت اور ایک جگہ جمع ہو گئی تھیں۔ یہ سب صاحب کردار اور بلند
مرتبہ لوگ تھے۔ اور ان کے درمیان جناح صاحب تھے جو کسی سے کسی طرح بھی کم نہ تھے
ان کے سامنے ایک ایسا مقصد تھا جس کا ہر ایک مخالف تھا مگر اپنی بے پناہ قوت ارادی
کی بدولت انہوں نے یہ عظیم مقصد حاصل کیا۔ انہوں نے اتنا بڑا کام جو [illegible]
کے بغیر سر انجام دیا۔ ان کو [illegible] حربوں کا سہارا لینے کی ضرورت نہ پڑی۔ اس لیے کہ وہ خود
ایک بہت بڑے آدمی تھے۔ مجھے یقین ہے کہ جب بیسویں صدی کی تاریخ مرتب ہو گی تو
قائد اعظم کی عظمت خود ابھر کر سامنے آئے گی۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ ہے کہ ایسے وقت
میں انہوں نے ایک نئی قوم کو جنم دیا جب نظریۂ قومیت روبہ زوال تھا۔ مغرب کی قوم پرستی
کی وجہ سے انسانیت دو عالمی جنگوں کا شکار ہو چکی تھی۔ ایسے وقت میں تاریخی عوامل کا تقاضا
کہ انہوں نے ایک نئی قوم کی تشکیل کی۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ان کے نظریات کی بنیاد
بہر حال انسانی حقوق اور جمہوری اقدار پر تھی۔ دوسرے رہنماؤں سے، اختلافات اور ان
اختلافات کے باوجود کہ سیاست میں قیادت کے بارے میں ان کے اپنے اصول تھے۔ مسٹر جناح
جمہوری اقدار اور حصول آزادی کی تحریک کے برابر کے شریک تھے۔ اس لحاظ سے وہ بیسویں
صدی کی تاریخ میں ایک عظیم الشان شخصیت کی صورت میں ابھر کر نظر آتے ہیں۔

انتقال اقتدار کے بعد ایک مرتبہ مجھے اس وقت پاکستان جانے کا اتفاق ہوا جب
میں کانگریس کے سلسلے میں ہندوستان چھوڑ رہا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں جب میں دوبارہ پاکستان گیا تو
قائد اعظم رخصت ہو چکے تھے۔ پھر ۱۹۶۲ء میں بھی پاکستان جانے کا اتفاق ہوا اور میں صرف یہ کہنے
پر اکتفا کروں گا کہ پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ قائد اعظم اور لیاقت علی خان دونوں ہی جلد [illegible]
چلتے ہو گئے۔ اگر ان دونوں حضرات کو پانچ دس سال اور مل جاتے تو ملک کو پارلیمانی اور جمہوری
نظام کے مطابق چلانے والی تربیت یافتہ اور دیرپا قیادت مل جاتی۔

قائدِ اعظم اور نوجوان

"مسلم قوم کی از سرِ نو تعمیر و تنظیم میں نوجوانوں کو یقیناً ایک اہم کردار ادا کرنا ہے۔ میں آپ کے لئے دعا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ اس کام میں پورا پورا حصہ لیں گے۔ لیکن آپ اپنی تعلیم کا بالکل نقصان نہ کریں۔ اپنا وقت بے وجہ ضائع نہ کریں اور تعلیمی زندگی کے تقاضوں کو بلا کم و کاست پورا کریں۔"

(مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سرحد کے نام پیغام
۱۸ جنوری ۱۹۴۵ء)

ابو سعید انور

آزادی رائے کے علمبردار

مجھے قائد اعظمؒ سے پہلی بار شرفِ ملاقات فروری ۱۹۳۶ء میں حاصل ہوا۔ لاہور میں مسجد شہید گنج کے انہدام پر خونِ مسلم کی جو ارزانی ہوئی اس پر احتجاج کے سلسلے میں مولانا ظفر علی خان اور کچھ دوسرے سرکردہ مسلمان رہنما مختلف مقامات پر نظر بند کر دیئے گئے تھے۔ اس پر قائد اعظمؒ خاموش نہ رہ سکے۔ اور انہوں نے اس مسئلے کو سلجھانے کی زبردست کوشش کی۔ اس وقت وہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں یکساں مقبول تھے۔ انہی کے کہنے پر اس وقت کے گورنر نے تمام نظر بندوں اور قیدیوں کو رہا کر دیا۔

اس رہائی کے کچھ دن بعد قائد اعظمؒ نے مولانا ظفر علی خان اور رہائی پانے والے دیگر رہنماؤں کو لاہور مدعو کیا۔ اس ملاقات کے تاثرات آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہیں۔ جناح صاحب کا موقف یہ تھا کہ مسجد کی شہادت کا واقعہ بلا شبہ المناک ہے اور حکومت نے بھی بہت زیادتی کی ہے۔ لیکن پہلے ہی بہت سی بے گناہ جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ آپ لوگوں نے نظر بندی اور دوسرے سینکڑوں لوگوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ مسجد شہید گنج پر مسلمانوں کے موقف میں بہت وزن ہے۔ اس لیے ایجی ٹیشن کے بجائے عدالت کی طرف رجوع کیا جائے۔ انہوں نے بہترین قانونی خدمات مہیا کرنے کا وعدہ بھی فرمایا۔

دوسری اہم بات جو زیر بحث آئی وہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ

پہلے انتخابات کی آمد آمد تھی۔ مسٹر جناح اس بات پر زور دے رہے تھے کہ مسلمانوں کو ایک جماعت کی صورت میں منظم ہونا چاہیئے، بصورت دیگر ان کی قوت بھی بٹ جائے گی اور نتائج کے اعتبار سے یہ بات مسلمانانِ ہند کے مفاد میں نہ ہوگی۔ ان کے مخاطب زیادہ تر مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد اسحاق مانسہروی، سید زین العابدین اور ملک لال دین قیصر وغیرہ تھے۔ دیگر احباب میں ملک برکت علی، نواب محمد یار دولتانہ (میزبان)، پیر تاج الدین اور خلیفہ شجاع الدین تھے۔ مؤخر الذکر گروہ اس زمانے میں نیشنلسٹ خیالات کا نمائندہ تھا۔ اگرچہ وہ مسجد شہید گنج کے معاملے میں کانگریس اور ہندوؤں کے رویہ سے نالاں تھے۔

اس وقت میری حیثیت ایک ایسے بچے کی سی تھی جو سکول میں زیرِ تعلیم ہو اور جسے یکایک کسی یونیورسٹی میں اونچی سطح کے مباحثے میں شرکت کرا دی جائے۔ زندگی کے اکیس سال اور طالب علمی میں کانگریس تحریک سے وابستگی کے پس منظر کے سوا کوئی بات ایسی نہ تھی کہ میں اس بحث میں حصہ لینے کی جرأت کر سکتا۔ بہرحال اس پہلی ملاقات کا تاثر یہ تھا کہ قائداعظمؒ بہت خوش پوش، خوبصورت اور نفیس آدمی لگتے تھے۔ بات کرتے وقت ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ جو دوسرے شرکائے محفل کی گفتگو میں مفقود تھا مسٹر جناح کو ان سے ممیز کرتا تھا۔

مولانا ظفر علی خان نے کچھ عرصہ بعد مسٹر جناح سے اپنی جماعت مجلس اتحاد ملت اور مسلم لیگ کے ادغام کا سوال اٹھایا۔ اس پر قائداعظمؒ کا موقف واضح تھا یعنی تحریک عمل پہلے کی طرح جاری رہے اور اگر مسلم لیگ میں شامل ہونا ہے تو ادغام نہیں اپنی جماعت توڑ کر سب ساتھیوں سمیت مسلم لیگ میں شامل ہو جائیے۔ مسٹر جناح اِسی موقف پر قائم رہے اور مولانا مصلحت ادغام پر راضی نہ ہوئے۔ بالآخر اپریل ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس خاص لکھنؤ میں اعلان کیا گیا کہ مجلسِ اتحادِ ملت توڑ دی گئی ہے اور اس کے تمام ارکان مسلم لیگ میں شامل ہو گئے ہیں۔ تنظیمی حوالے سے قائداعظمؒ کی یہ ایک شاندار کامیابی تھی۔

ان دنوں قائداعظمؒ جب لاہور میں مسلم لیگ کے عام جلسوں سے خطاب فرماتے

تو حاضری مایوس کن ہوتی۔ وہ خود کبھی مایوس نہ ہوتے۔ ریلوے اسٹیشن پر استقبال کرنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ مگر انہیں اپنے مشن سے اس قدر محبت تھی کہ مسلمانوں کی اس سرد مہری پر کبھی شکایت نہ کرتے۔ ایک مرتبہ استقبال کرنے والوں نے ان سے اس عام بے حسی کی شکایت کی تو فرمانے لگے "گھبرائیے نہیں بہت جلد مسلمان جاگ جائیں گے۔" پھر وہی لاہور تھا کہ ریلوے اسٹیشن پر ہجوم غفیر ہوتا اور قائداعظمؒ کا ریل کے ڈبے سے اترنا بھی دوبھر ہو جاتا۔

سیاسی زندگی میں مجھے بہت سے قائدین کو نزدیک سے دیکھنے کی سعادت ملی مگر قائداعظمؒ اپنی نشست و برخاست میں منفرد تھے۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں نہیں کرتے تھے۔ ہمیشہ معاملے کی بات۔ دوسروں کے متعلق بات۔ اخبارات کے حوالے پر اظہار خیال اور دوسروں کی رائے دریافت کرنا۔ سیاسی مسائل پر بحث اور بالخصوص نوجوانوں کو قومی باتوں میں سیاسی تربیت دینا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

ایک بار لاہور میں نوجوانوں اور طلباء کے ساتھ سیاسی صورت حال پر بات ہو رہی تھی کہ آپ یکایک آواز قدرے بلند کر کے فرمانے لگے "دیکھئے میں جو کچھ کر رہا ہوں مسلمان قوم کے لیے اور آپ لوگوں کے مستقبل کے لیے ہے۔ مجھے اپنے لیے کیا چاہئے؟" قریب ہی ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا "جناب ایک پیالی چائے۔" قائداعظمؒ نے چمک کر فرمایا "خاموش رہو، جب اہم بات کر رہا ہوں!"

کانگریس اور ہندو پریس مسلم لیگ اور قائداعظمؒ پر تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا۔ مسلم لیگ تنظیم کے مراحل طے کر رہی تھی۔ اگرچہ مولانا ظفر علی خان اور اتحاد ملت کے بے شمار کارکنوں کی آمد سے تنظیمی اور تشہیری سرگرمیاں بڑھ گئی تھیں پھر بھی ان حملوں کا مقابلہ کرنے میں مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ قائداعظمؒ کو ان کے بعض رفقاء نے مشورہ دیا کہ مجلس احرار سے بات کرنا چاہئے۔ ان کے پاس بہت سے شعلہ بیان مقرر ہیں ان کے آنے سے مسلم لیگ کے پراپیگنڈہ میں بہت آسانی ہو جائے گی مگر اس پر اچھا خاصا خرچہ آئے گا یعنی ان لوگوں کی مالی معاونت کرنی پڑے گی۔ قائداعظمؒ نے اس تجویز کو

فی الفور مسترد کر دیا۔ اور فرمایا "لیگ تو ہمارے پاس اتنے فنڈز نہیں ہیں۔ پھر جو بات بغیر لالچ کے کہی جائے اس کا اثر ہوتا ہے کہ ایسے مقررین حاصل کرکے آپ مسلم لیگ جیسی بنا لیجئے۔"

اپریل ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کے بعد ایک بہت بڑا جلسہ ہو رہا تھا۔ قائد اعظمؒ کے جلسہ گاہ میں پہنچنے میں ابھی دیر تھی۔ جلسہ مولانا شوکت علی کی صدارت میں شروع کر دیا گیا۔ ایک آدھ تقریر کے بعد مولانا شوکت علی نے چندے کے لیے اپیل کر دی اور کارکن جلسہ گاہ میں عوام سے چندہ وصول کرنے لگے۔ عین اس وقت قائد اعظمؒ تشریف لے آئے۔ اور مائک سنبھال کر مختصر تقریر کی۔ فرمایا "میں اس طرح چندہ کرنے کے خلاف ہوں۔ مسلم لیگ کو انگریز اور ہندو سے جنگ لڑنے کے لیے روپے کی سخت ضرورت ہے۔ مجھ کو اس کا احساس ہے مگر میں اس طریق کار کے تحت خلاف ہوں۔ ماضی میں مسلمانوں کی جماعتیں چندے کے معاملے میں بدنام ہو چکی ہیں۔ میں مناسب وقت پر آپ سے چندے کی اپیل کروں گا۔ بنک میں حساب کھولا جائے گا اس میں رقوم جمع کرائیں۔ یا مجھے براہ راست منی آرڈر کے ذریعے بھیجیں۔ ہر شخص کو اس کی رسید بھیجی جائے گی۔ اور حساب رکھا جائے گا۔" اس کے بعد انہوں نے چندے کی وصولی رکوا دی۔ عوام نے بعد میں مسلم لیگ فنڈ کے لیے اپیل پر بینک میں لاکھوں روپے جمع کرائے۔ مسلم لیگ کی قیادت پر قومی روپے میں خورد برد کا الزام کبھی نہیں آیا۔

<u>سکندر جناح پیکٹ</u>: سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب اور ان کی جماعت کے مسلم ارکان اسمبلی ۱۹۳۷ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کے لکھنؤ اجلاس میں شامل ہوئے۔ اس موقع پر ایک مسودہ پڑھا گیا جو سکندر جناح پیکٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی قائم رہے مگر کل ہند معاملات میں اس کے مسلم ارکان مسلم لیگ کے فیصلوں کی پابندی کریں گے۔ لائل پور (فیصل آباد) میں پنجاب پراونشل مسلم لیگ کانفرنس ۱۹۴۲ء کے اجلاس میں سر سکندر حیات کی موجودگی میں قائد اعظمؒ نے اس مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا "سکندر جناح پیکٹ کو بہت اچھالا

جو ہوتا ہے۔ بھلا ایک لیڈر اور پیروکار کے درمیان معاہدہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

یونینسٹ پارٹی کے مسلمان اس حد تک مجبور تھے کہ مسلم لیگ کے خلاف کھل کر بات نہیں کر سکتے تھے اس لیے پنجاب کے زمینداروں نے "جاٹ سبھا" کے نام سے ایک تنظیم بنا ڈالی۔ اس کے صدر سردار حبیب اللہ تھے۔ انھوں نے ایک بار قائداعظم کے خلاف بیان دیا۔ قائداعظم مخالف قوتوں کی سرگرمیوں سے پوری طرح واقف رہتے تھے ان دنوں لاہور آئے ہوئے تھے۔ "ممدوٹ ولا" میں قیام تھا۔ ایسے مواقع پر میں اکثر حاضر رہتا۔ مجھ سے دریافت کیا "یہ حبیب اللہ کون ہے؟"۔ میں نے بتایا کہ ضلع لاہور کا ایک زمیندار ہے اور ہمارے نزدیک ہی رہتا ہے۔ بلکہ یہ سڑک اسی کے نام سے موسوم ہے۔" فرمانے لگے "اس کے متعلق اور کیا جانتے ہو؟ اس کی تعلیمی استعداد کیا ہے؟ انگریزی بیان تو بہت اچھی زبان میں لکھا گیا ہے۔" میں نے سردار حبیب اللہ کی قابلیت وغیرہ کے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا۔ کہنے لگے "تعجب ہے تم اپنے مخالفوں کے متعلق پوری واقفیت نہیں رکھتے۔"

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے جلسوں میں بعض شخصیتوں کی قائداعظم سے کھلم کھلا مخالفت ہوا کرتی تھی۔ مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان اور [illegible] بعض اوقات کونسلر ان حضرات کی تقریروں میں رکاوٹ ڈالتے تھے مگر قائداعظم ہمیشہ اظہار رائے کی پوری آزادی دیتے تھے۔ لہٰذا سب کو ان حضرات کی تقریریں سننا پڑتی تھیں۔ ایسے عالم میں ایک بار ایسا واقعہ پیش آیا کہ قائداعظم کی رائے سے اردو میں ایک مسودہ پڑھا گیا۔ غالباً ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس میونسپل ہال دہلی میں ہو رہا تھا۔ تمہید سے کے مطابق جب قرارداد صدر دفتر کو بھیج دیا گیا کہ برطانوی حکومت کے معاندانہ رویہ کے پیش نظر مسلم لیگ کے تمام ارکان مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں سے مستعفی ہو جائیں۔ جب یہ قرارداد پیش کرنے کا مرحلہ آیا تو معمول کے خلاف قائداعظم نے مجھ سے کہا کہ میں قرارداد واپس لے لوں۔ ان سے حضرات بھی مختصراً بیان کیے۔ مگر میں قرارداد پیش پیش کرنے پر مصر تھا۔ مجھے اسٹیج پر بلایا گیا۔ جب میری تقریر کے دوران بتایا ہے

بعض ریسنٹ ارکان نے مخالفت شروع کی تو قائد اعظمؒ نے انہیں آرڈر آرڈر کر کر بٹھا دیا۔ اسٹیج پر سر محمد یامین بحیثیت رکن مرکزی مجلس عاملہ بیٹھے تھے۔ وہ بھی بہت بڑبڑا رہے تھے۔ مگر قائد اعظمؒ نے انہیں سختی سے ڈانٹ دیا۔ اور مجھے اپنا موقف بیان کرنے کی پوری اجازت دی۔ اگرچہ قرارداد کے حق میں ایک ووٹ بھی نہ ملا۔ مگر مجھے جو کہنا تھا وہ مجھے کہنے کا موقع دیا گیا۔

تدبر اور تحمل: قیام پاکستان سے پہلے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا آخری اجلاس دہلی کے امپیریل ہوٹل میں منعقد ہوا۔ ابھی کارروائی جاری تھی کہ علامہ مشرقی کے پیروکار بد نیت حال میں داخل ہونے کی نیت سے آئے۔ چند پٹاخے کی صورت ہو گئے۔ بیلچے سے مسلح خاکسار سیڑھیاں چڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ ابھی میں بھگدڑ سی مچ گئی مگر اسٹیج پر قائد اعظمؒ نہایت اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ انہوں نے کسی قسم کی پریشانی یا تشویش کا اظہار نہ کیا۔

قیام پاکستان کے بعد جب قائد اعظمؒ بحیثیت گورنر جنرل لاہور تشریف لائے تو انہوں نے والٹن مہاجرین کے کیمپ دیکھے تو وہ انتہائی غم واندوہ کا پیکر نظر آئے۔ اس کے بعد یونیورسٹی گراؤنڈ کے جلسے میں تشریف لائے۔ میں اسٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ کوئی مسلم لیگی لیڈر یا وزیر اس جلسے میں آنے کی جرأت نہ کر سکا۔ صرف وزیر مہاجرین راجہ غضنفر علی ایک کونے میں آکر بیٹھ گئے۔ قائد اعظمؒ نے ایک پُر وقار اور حوصلہ مندانہ تقریر میں لوگوں کو ان کی تباہ حالی پر حوصلہ اور تسلی کا پیغام دیا اور کہا: "یہ عظیم قربانی پاکستان کے لیے دی گئی ہے۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم سے سب حالات معمول پر آ جائیں گے۔ اور آپ کی تکالیف دور ہو جائیں گی۔ مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ انگریز نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا۔ پاکستان دنیا میں تا قیامت قائم رہنے کے لیے بنا ہے۔ ہم سب مل کر محنت کریں گے اور ایک زندہ قوم کی حیثیت سے عظیم الشان وطن تعمیر کریں گے۔" ان کے ایک ایک لفظ میں جرأت، بہادری اور روشن مستقبل کا پیغام تھا۔

قیام پاکستان کے ساتھ ہی مسلمانان کشمیر پر ڈوگرہ فوج کے ظلم و ستم کا دور شروع ہوا

تو قائدِ اعظم لاہور تشریف لائے۔ اس موقع پر انگریز کمانڈر انچیف نے کشمیر پر پاکستان کی طرف سے فوجی کارروائی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ قائدِ اعظم سخت پریشان تھے۔ گورنر ہاؤس لاہور کے کمرے میں بے تابی کے ساتھ اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ یکایک فرطِ جذبات سے ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش شروع ہو گئی۔ محبوب احمد قریشی جوائنٹ سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے باہر جانے کو کہا۔ غالباً کسی شخص نے قائدِ اعظم کو اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بعد ان کی صحت دن بدن جواب دینے لگی۔ مگر انہوں نے کاروبارِ حکومت میں آخری وقت تک نہایت دلچسپی لی۔ اور قوم کو اپنے دکھ اور تکلیف کا علم نہیں ہونے دیا۔

میاں محمد شفیع (م۔ش)

۲۳ مارچ کا اجلاس

اکیس مارچ ۱۹۴۰ء کی صبح جب جھنڈیوں سے آراستہ خصوصی ٹرین جس میں ہندوستان بھر کے مسلم لیگی رہنما قرارداد لاہور (قرارداد پاکستان) کا تاریخی فیصلہ کرنے پنجاب کے دارالحکومت آ رہے تھے، لاہور ریلوے اسٹیشن کے خصوصی پلیٹ فارم پر آ کر رکی۔ اور فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ سے قائداعظمؒ اپنی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کی معیت میں باہر آئے تو پنجاب کے وزیراعلیٰ سر سکندر حیات خان، جو ان کا استقبال کر رہے تھے، مسلم لیگ کے رہنما کے گلے میں ہار ڈالنے کے لیے آگے بڑھے۔ اس پر قائداعظمؒ نے درشتی سے فرمایا: "نہیں، میں کسی ایسی سرزمین پہ اپنے گلے میں پھولوں کے ہار پہننا پسند نہیں کرتا جہاں صرف دو روز پہلے بے گناہ اور معصوم مسلمانوں کا خون بہایا گیا ہو!"

جب قائداعظمؒ لوگوں سے مصافحہ کرنے کے لیے آگے بڑھے تو اس وقت بھی ان کے چہرے سے خفگی اور ناراضگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ان کا خیرمقدم کرنے والوں میں پنجاب مسلم لیگ کے صدر نواب سر محمد شاہ نواز آف ممدوٹ، پنجاب کی کابینہ کے مسلمان ارکان، صوبہ سرحد کے سردار اورنگ زیب خان، نواب مظفر خان اور میاں امیرالدین شامل تھے۔

پتہ چلا کہ نئی دہلی سے لاہور تک رات بھر سفر کے دوران میں تمام اہم ریلوے اسٹیشنوں پر مسلم عوام لاہور میں خاکساروں پر فائرنگ کے خلاف مظاہرے کر رہے ہیں اور پنجاب کی وزارت کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ امرتسر ریلوے اسٹیشن پر احراریوں کے ایک زبردست مجمع نے قائد اعظمؒ کو مجبور کیا کہ وہ ڈبے سے باہر نکل کر ان سے خطاب کریں۔ مظاہرین پنجاب کے وزیر اعلیٰ کو سزائے موت دینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ لاہور ریلوے اسٹیشن پر پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے ساتھ قائد اعظمؒ کا روکھا برتاؤ صرف انہیں یہ جتانے کے لیے تھا کہ ۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء کو جو کچھ ہوا اس پر وہ کس قدر ناراض ہیں۔ جب قائد اعظم ریلوے اسٹیشن سے باہر کھلی فضا میں تشریف لائے تو اداس اور برہم عوام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جو میلا رام تالاب تک پھیلا ہوا تھا، زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے ان کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ قائد اعظمؒ کو ایک بڑے جلوس کی شکل میں ریلوے اسٹیشن سے نہایت سلیقے سے آراستہ بازاروں یعنی لنڈا بازار، کشمیری بازار اور ٹکسالی بازار کے راستے منٹو پارک لے جانے کا انتظام کیا گیا۔ منٹو پارک میں مسلم لیگ کے اجلاس کے لیے ایک وسیع و عریض پنڈال تعمیر کیا گیا تھا۔ لیکن قائد اعظمؒ نے یہ کہتے ہوئے جلوس میں جانے سے بڑی سختی سے انکار کر دیا کہ جب یہاں کی مغموم فضا میں شہداء کا خون رہا ہے تو میں بھلا جلوس میں کیسے شریک ہو سکتا ہوں۔

قائد اعظمؒ کی لاہور تشریف آوری سے دو روز قبل یعنی ۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء کو یہاں خاکساروں کا پولیس سے تصادم ہوا تھا اور کئی خاکسار شہید اور متعدد زخمی ہوئے تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے انعقاد سے پہلے یہ ایسی خطرناک تمہید کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خبریں ہر قسم کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں کہ کیا مسلم لیگ کا اجلاس پروگرام کے مطابق منعقد ہو گا؟ کیا یہ اجلاس کسی اور تاریخ کو کسی اور جگہ کیا جائے گا؟ پنجاب مسلم لیگ لاہور اور

وہاں ہی مسلم لیگ کی ہائی کمان کے لیڈروں کے مابین بڑی عجلت میں ٹیلیفون پر بات چیت شروع ہو گئی۔ مگر جب قائداعظمؒ نے اجلاس کو ملتوی کرنے کی تجویز سختی سے مسترد کر دی تو پھر قطعی طور پر طے ہو گیا۔

قائداعظمؒ جب ریلوے اسٹیشن سے ممدوٹ ولا جا رہے تھے تو وہ رپورٹروں سے ملتے وقت عزم و سکون کی مجسم تصویر نظر آ رہے تھے۔ ٹریبیون کے مسٹر لے سی بال نے اپنے تمام پیشہ ورانہ داؤ پیچ استعمال کیے کہ کسی نہ کسی طرح خاکساروں اور پولیس کے تصادم پر قائداعظمؒ کی رائے کا اظہار کروا سکے۔ لیکن قائداعظمؒ نے کہا کہ وہ دونوں طرف سے حالات معلوم کیے بغیر اور خود تفتیش کیے بغیر کسی مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتے۔ ہر چند کہ انہیں اشتعال دلانے کی کوشش کی گئی لیکن قائداعظمؒ پھر بھی پرسکون رہے۔ قائداعظمؒ نے محض اتنا کہا کہ مسلم لیگ کا اجلاس ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں ایک عظیم کارنامہ ہوگا۔

زخمی خاکساروں کی عیادت: قائداعظمؒ رپورٹروں کو غصے اور جھنجھلاہٹ کی حالت میں چھوڑ کر آرام کرنے چلے گئے۔ پھر میاں امیرالدین اور سردار اورنگزیب ممدوٹ ولا آ گئے۔ اور انہوں نے قائداعظمؒ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی۔ کہ انہیں ان خاکساروں کی عیادت کے لیے، جو پولیس کے ساتھ تصادم میں زخمی ہو گئے ہیں، میو ہسپتال جانا چاہیے۔ اس پر انہوں نے بڑی خوشی سے اتفاق کیا۔ اور چند ہی منٹ کے بعد ان کی کار میو ہسپتال کی طرف رواں تھی۔ قائداعظمؒ نے ہسپتال کے مختلف وارڈوں کا دورہ کیا۔ جہاں زخمی خاکسار زیر علاج تھے۔ انہوں نے ان سے نہایت ہمدردانہ اور محبت، محبت بھرے لہجے میں گفتگو کی۔ خاکسار قائداعظمؒ کی اس مشفقانہ عیادت سے بے حد متاثر ہوئے۔ چنانچہ اب تک جو فضا نہایت غیظ و غضب اور ہیجان کی تھی، وہ فضا خوشگوار نظر آنے لگی۔ وہ لوگ جو یہ سوچ سوچ کر پریشان تھے کہ اگر فضا اسی طرح مکدر رہی تو مسلم لیگ کے اجلاس میں فساد کا خطرہ ہے۔ قائداعظم

کے اس اقدام سے بہت پر امید ہو گئے۔ بیرسٹر کے ایل گابا، راجہ رشید لطیف اور میاں عبدالعزیز بی اے ایل ایل بی اور چند دوسرے لوگ جو مسلم لیگ کے اجلاس میں رخنہ ڈالنے کی تیاریاں کر رہے تھے، خود آ کر قائداعظمؒ سے ملے اور انہوں نے قائد کو اپنی پوری پوری مدد اور تعاون کا یقین دلایا۔

میو ہسپتال سے قائداعظمؒ سیدھے منٹو پارک (موجودہ علامہ اقبال پارک) گئے جہاں انہوں نے ایک بڑے ہجوم کی موجودگی میں پرچم کشائی کی رسم ادا کی۔ انہوں نے اپنی مختصر سی تقریر کی ابتدا یہ کہہ کر کی:

"میں ابھی ابھی اپنے بچوں، اپنی قوم کے جوانوں کی عیادت کے لیے میو ہسپتال گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ روبصحت ہیں۔"

یہ اعلان سنتے ہی فضا "اللہ اکبر" اور "زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھی اور شک و شبہ کا دھندلکا مارچ کے روشن سورج کی کرنوں میں تحلیل ہو کر رہ گیا۔

پرچم کشائی کی تقریب کی تقریر ختم کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں نہایت ہی خراب فضا میں ہو رہا ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک عظیم قوم اور عظیم عوام کے لیے آزمائش کیا ہوتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ جتنی جتنی مشکلات بڑھتی جائیں ویسے ویسے ہماری قوت برداشت میں اضافہ ہوتے رہنا چاہیے۔

۲۲ مارچ ۱۹۴۰ کو منٹو پارک میں بے مثال ہجوم تھا۔ مسلم لیگی مندوبین اور نمائندے علامہ اقبالؒ کی آخری آرام گاہ سے بمشکل نصف میل کے فاصلے پر واقع بادشاہی مسجد کے فلک بوس میناروں کے زیر سایہ قائداعظمؒ کی ولولہ انگیز اور مسحور کن تقریر سن رہے تھے۔ قائداعظمؒ سفید چوڑی دار پاجامہ اور سیاہ اچکن میں ملبوس تھے۔ یک چشمی عینک ان کی آنکھوں میں حمائل تھی۔ آپ نے سامعین سے دو گھنٹے سے زیادہ دیر تک اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں خطاب کیا۔

قائداعظمؒ کی اس تقریر کے متن کی تفصیلات درج کرنے کا یہ محل نہیں

تاہم یہ واضح تھا قائد اعظمؒ اس وقت ملّت اسلامیہ کے علیحدہ اور جداگانہ تشخص سے نہ خود مسلمانوں کو قائل کرنا چاہتے تھے بلکہ اس عہد کی سیاسی کشمکش کے دو بڑے حریفوں یعنی ہندوؤں اور انگریزوں پر بھی واضح کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ثقافتی اور سماجی اختلافات پر روشنی ڈالی۔

ہندو و مسلمان علیحدہ قومیں ہیں :۔ آپ نے فرمایا۔ "ایک ہزار سال اکٹھے رہنے کے باوجود ہندو اور مسلمان قومیں آج بھی اتنی مختلف ہیں جتنی کہ پہلے دن تھیں۔ یہ امر خلاف توقع ہے کہ ان دونوں قوموں کو کبھی بھی محض جمہوری آئین کے ذریعے ایک قوم میں تبدیل کیا جا سکے گا۔ ہندو اور مسلمان نہ صرف دو مختلف مذاہب کے ماننے والے ہیں بلکہ سماجی اور ثقافتی طور پر بھی الگ الگ ہیں۔ ان کے ادب الگ روایات الگ، رہن سہن سب میں بعد المشرقین ہے۔ نہ ان کا آپس میں شادی بیاہ ہو سکتا ہے، نہ یہ دونوں ایک جگہ بیٹھ کر کھا پی سکتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف تہذیبوں اور مختلف تمدنوں کا نام ہے اور ان دونوں قوموں کی بنیاد متضاد نظریات اور خیالات پر ہے۔"

قائد اعظمؒ نے جذباتی انداز میں اعلان کیا۔ "اگر برطانوی حکومت خلوص اور سنجیدگی سے برصغیر کے عوام کی خوشحالی اور امن کی خواہاں ہے تو ہم سب کا واحد مقصد یہ ہونا چاہیے کہ برصغیر کو خود مختار ریاستوں میں تقسیم کر کے بڑی قوموں کے لیے جدا جدا وطن بنا دیے جائیں۔"

قرارداد پاکستان :۔ قائد اعظمؒ کی اس ولولہ انگیز تقریر نے آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے لیے راستہ ہموار کر دیا کہ وہ اس قرارداد کا مسودہ تیار کرے جو قرارداد لاہور اور بعد میں "قرارداد پاکستان" کے نام سے موسوم ہوئی یہ ثابت کرنے کے لیے بقول مسٹر حسن اصفہانی بہت سی شہادتیں موجود ہیں کہ قرارداد کا جو مسودہ سبجیکٹ کمیٹی کو پیش کیا گیا تھا وہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات نے تیار کیا تھا۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے سول اینڈ ملٹری گزٹ نے صفحہ اول پر دو کالمی خبر چھاپی
یہ خبر اخبار کے اخبار کے سیاسی نمائندے کے حوالے سے دی گئی تھی۔ اس خبر
میں قرارداد کی نمایاں خوبیاں بتائی گئی تھیں جو ورکنگ کمیٹی کے غور و فکر کا نتیجہ تھی
قرارداد اس وقت تک سبجیکٹ کمیٹی کو پیش نہیں کی گئی تھی۔ اس نمائندہ نے
یہ انکشاف بھی کیا کہ قائداعظمؒ اور سر سکندر حیات کے درمیان ایک ملاقات ہو
چکی ہے جسے تسلی بخش قرار دیا گیا۔ سیاسی نمائندے کا نام مسٹر منوہر لال بجرو جیہ
تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ تک ان کی پہنچ تھی۔ (میں ذاتی طور پر
جانتا ہوں کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے سیکرٹری میر نور احمد نے مسٹر بجرو جیہ کو بریف
کیا تھا)

اگلے روز یعنی ۲۳ مارچ کو بنگال کے وزیر اعلیٰ مسٹر اے کے فضل الحق نے شستہ
اردو میں تقریر کرتے ہوئے جو فارسی اشعار سے مزین تھی، اصل قرارداد پیش کی
جس میں مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان کے شمال مغرب اور مشرق میں جہاں مسلمان اکثریت
میں ہیں ضروری علاقائی ردوبدل کے ساتھ آزاد اور خود مختار ریاستیں قائم کی جائیں۔ اس
کی تائید چوہدری خلیق الزماں (یوپی)، مولانا ظفر علی خان (پنجاب)، سردار اورنگ زیب خان
(سرحد) اور حاجی سر عبداللہ ہارون (سندھ) نے کی۔ قرارداد پر بحث شام تک
جاری رہی۔

۲۴ مارچ کو قائداعظمؒ کی ناگزیر عدم موجودگی کے سبب استقبالیہ کمیٹی کے
صدر نواب سر محمد شاہنواز خان ممدوٹ نے صدارت کی۔ اس روز جن لوگوں نے
قرارداد لاہور کی حمایت کی۔ ان میں سے محمد اسمٰعیل خان (بہار)، قاضی محمد عیسیٰ (بلوچستان)
مسٹر آئی آئی چندریگر (بمبئی)، سید عبدالرؤف (سی پی) اور ڈاکٹر محمد عالم (پنجاب)
قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر عالم نے کانگریس سے مستعفی ہو کر مسلم لیگ میں شمولیت
اختیار کی تھی۔ اس کے بعد کھانے کے لیے مجلس ملتوی ہو گئی۔
شام کا اجلاس آٹھ بجے قائداعظمؒ کی صدارت میں شروع ہوا جن لوگوں نے

اس موقع پر تقریریں کیں ان میں آگرہ کے سید ذاکر علی، بیگم محمد علی جوہر اور مولانا عبد الحامد بدایونی شامل تھے۔ اس کے بعد قرارداد ایوان میں پیش کی گئی۔ اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔

اس کے علاوہ قائداعظمؒ نے ایک قرارداد میں مطالبہ کیا کہ خاکساروں اور پولیس کے تصادم کے سلسلے میں عدالتی تحقیقات کرائی جائے۔ یہ قرارداد کسی بحث کے بغیر منظور کر لی گئی قائداعظمؒ نے اردو میں اختتامی تقریر کرتے ہوئے تمام لوگوں کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اپنی مخلصانہ خدمات کے ذریعے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کو کامیاب بنایا۔ انہوں نے کہا کہ اس اجلاس نے مسلم قوم کے حق خود اختیاری کی جدوجہد میں ایک نیا باب کھولا ہے۔ آپ نے مندوبین اور دوسرے حاضرین کو تلقین کی کہ وہ فوراً مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے منظم کریں۔ کیونکہ یہی قوت مسلمانوں کے مطالبہ آزادی کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوگی۔

خلیل صحافی

صحافت کی اہمیت

قیام پاکستان سے پہلے مجھے کئی سیاسی رہنماؤں سے ملاقات کا موقع ملا لیکن قائد اعظم کی شخصیت میں جو وقار اور رعب تھا وہ دوسروں کے ہاں بہت کم تھا۔ ان کے مخالف بھی اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ وہ دیانت کے پیکر تھے اور انہیں کسی قیمت پر خریدا نہیں جا سکتا تھا۔

قائد اعظم کی پہلی تقریر میری چشمِ تصور میں محفوظ ہے۔ انہوں نے دہلی دروازہ کے باہر مسلمانانِ لاہور کے ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کیا تھا۔ اس وقت انہوں نے سر پر مشہدی لنگی باندھ رکھی تھی۔ غالباً زندگی میں پہلی دفعہ انہوں نے مشہدی لنگی باندھی تھی۔ اور وہ اس لنگی میں بہت پرکشش نظر آ رہے تھے انہوں نے انگریزی میں تقریر شروع کی تو مجمع کے ایک حصہ سے شور اٹھا۔ "اردو میں، اردو میں"

قائد اعظم تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ ماتھے پر ہلکی سی شکنیں ابھریں لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مسکرائے اور انہوں نے اردو میں تقریر شروع کر دی۔ کوئی دس منٹ تک وہ اردو میں تقریر کرتے رہے۔ ان کی اردو ٹوٹی پھوٹی تھی لیکن ان کے الفاظ میں ایسا جادو تھا کہ چاروں طرف عقیدت اور محبت سے بھرپور فلک شگاف نعرے بلند ہو رہے تھے۔ اس کے بعد قائد اعظم نے کہا: "اب آپ

مجھے اجازت دیں کہ میں انگریزی میں تقریر کروں!" اور پھر انہوں نے ڈیڑھ دو گھنٹے تک تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ذاتی طور پر مجھے قائدِ اعظمؒ سے دو بار شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۴۰ء میں جب آل انڈیا مسلم لیگ نے منٹو پارک میں شہرۂ آفاق لاہور قرارداد منظور کی۔ جس سے اس برصغیر کے مسلمان حیاتِ ملی کے ایک نئے موڑ پر آ گئے۔ مسلم لیگ کے اس اجلاس کا پنڈال اسی جگہ پر تھا جہاں آج یادگارِ پاکستان کا مینار ایستادہ ہے۔ اسی مقام پر قیامِ پاکستان کی پہلی کرن بیدار ہوئی جو چھیں کر ایک بقعۂ نور بن گئی۔

میں صحافی ہونے کی وجہ سے پنڈال میں ڈائس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ قراردادِ لاہور مولوی ابوالقاسم فضل الحق کی طرف سے انگریزی زبان میں پیش کی گئی۔ اور انگریزی ہی میں انہوں نے اس قرارداد پر وضاحتی تقریر کی۔ اس کی تائید میں مولانا ظفر علی خان نے اپنے مخصوص انداز میں اردو زبان میں کی۔

روزنامہ "احسان" کے مدیر ہونے کی حیثیت سے چند روز پہلے میں نے قائدِ اعظمؒ سے استدعا کی تھی کہ وہ روزنامہ "احسان" کے دفتر میں آ کر ٹیلی پرنٹر کا افتتاح کریں۔ آج یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کسی دفتر میں ٹیلی پرنٹر جیسی چیز کے افتتاح کے لیے قائدِ اعظمؒ جیسی عظیم شخصیت تشریف لائے۔ بات یہ ہے کہ ان دنوں ہندو اخبارات "پرتاپ" "ملاپ" اور "ویر بھارت" وغیرہ کے ہاں ٹیلی پرنٹر تھے۔ لیکن کسی مسلم اخبار میں یہ مشین موجود نہیں تھی اور "احسان" پہلا مسلم روزنامہ تھا جس نے ٹیلی پرنٹر لگوانے کا اہتمام کیا اس لیے اس وقت اس واقعہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

قائدِ اعظمؒ نے یہ اطلاع بھجوائی کہ وہ "احسان" کے دفتر تشریف لا رہے ہیں۔ ہماری بدقسمتی یہ تھی کہ ہم نے ان کے خیر مقدم کے لیے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ "احسان" کا دفتر دہلی دروازہ کے باہر حجازی بلڈنگ میں تھا۔ اس عمارت کی حالت

بے حد خستہ اور بوسیدہ تھی۔ دفتر اوپر کی منزل میں تھا۔ نیچے گھوڑوں کے دلالوں،
مالشیوں اور ساز بنانے والوں کے اڈے تھے۔ وہاں ہر وقت گھوڑوں کی
گندگی موجود رہتی تھی۔ دفتر کی سیڑھیوں کے عین سامنے ریڑھا کھڑا تھا۔ دائیں
طرف ایک صاحب گھوڑے کے نعل باندھ رہے تھے۔ دوسری طرف ایک
نوجوان ملنگ بانکے گھوڑے کی مالش کر رہا تھا۔ گرد کی صفائی تو کرا دی گئی تھی
لیکن بوسیدہ عمارت کی جتنی بھی صفائی کرائی جائے اس کی خستہ حالی اتنی ہی
ابھرتی ہے۔ میں نے ریڑھے والے اور مالشیے سے گزارش کی کہ آج یہاں
قائداعظم تشریف لا رہے ہیں ذرا وہ اپنے کام کو روک دیں۔ ان لوگوں کے چہروں
پر کوئی خاص تغیر پیدا نہیں ہوا۔ اور مجھے یوں لگا گویا وہ یہ کہہ رہے تھے کہ
ایسے آدمی تو اخبار کے دفتر میں آتے ہی رہتے ہیں۔

بہرحال مجھے اطلاع ملی کہ قائداعظمؒ نیچے تشریف لے آئے ہیں۔ میں
بھاگا ہوا سیڑھیوں سے اترا۔ ملک نور الٰہی مرحوم مالک روزنامہ احسانؔ پہلے
ہی وہاں موجود تھے اور اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ مالشیے اور گھوڑوں
کو ایک طرف کر دیں تاکہ قائداعظمؒ گزر سکیں۔ قائداعظمؒ کے ماتھے پر ذرا بھی بل
نہ آیا اور وہ گھوڑوں، ریڑھوں سے بچتے بچاتے سیڑھیوں پر چڑھ گئے۔ میں ا
سیدھا نیوز روم میں لے گیا جہاں ٹیلی پرنٹر کام کر رہا تھا۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ہماری طرف سے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا
گیا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے بیٹھنے کے لیے بھی کوئی خاص بندوبست نہیں تھا۔
اور نہ ہی رپورٹر اور پریس فوٹوگرافر تھے جو اس یادگار واقعے کی تصویریں لے لیتے
اپنی ساری زندگی میں مجھے صرف اس بات کا پچھتاوا آج تک ہے کہ میں اس
وقت اس قسم کا اہتمام نہ کر سکا۔

قائداعظمؒ ٹیلی پرنٹر کے قریب کھڑے ہو گئے اور کچھ دیر تک ٹیلی پرنٹر
کی طرف دیکھتے رہے۔ اس پر ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کی جانب سے ایک

چنانچہ تہنیت بار بار کیمرے ذاتی قلم سے لکھا ہوا تھا۔ "ہم روزنامہ احسان کے تمام عملہ
قائداعظم محمد علی جناح کی آمد اور عظیم پرنٹنگ پریس کے افتتاح پر مبارکباد پیش کرتے ہیں"
قائداعظمؒ نے یہ فقرہ پڑھا اور خفیف سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر نمودار
ہوئی۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا۔ "مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

میں نے عرض کیا۔ "قائداعظمؒ آپ کو عظیم پرنٹنگ پریس سے باہر نکلتا ہوا رواں کاغذ
اسی طرح پھاڑنا ہوگا؟" جیسے میں نے انہیں کاغذ پھاڑ کر دکھایا۔

قائداعظمؒ نے کہا۔ "بہت اچھا!" یہ کہہ کر انہوں نے چلتے ہوئے کاغذ
کو پھاڑنے کی کوشش کی لیکن انہیں مہارت نہیں تھی اس لیے کاغذ ان کے ہاتھ
میں ہی الجھ کر رہ گیا۔ آپ نے فرمایا "مجھے افسوس ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکا
مسٹر جمیل ایک بار پھر کاغذ پھاڑ کر دکھاؤ!"

چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اور اس بار قائداعظمؒ بڑے غور سے میرے ہاتھ
کی طرف دیکھتے رہے۔ دوسری مرتبہ انہوں نے کاغذ بالکل صحیح طریقے سے پھاڑ لیا۔
ان کے عزم اور ارادہ کی یہ چھوٹی سی مثال میں اب تک نہیں بھول سکا۔ ملک
نورالٰہی نے کہا۔ "دعا کیجئے"۔ قائداعظمؒ نے دعا کے لیے اپنے ہاتھ اٹھائے اس
طرح یہ مختصر سی تقریب ختم ہو گئی۔ قائداعظمؒ نے عملہ کے تمام افراد سے
ہاتھ ملایا اور سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ کار میں بیٹھنے کے بعد
آپ نے مجھ سے صرف اتنا کہا۔

"میں خوش ہوں کہ تمہارا اخبار مسلم لیگ کے لیے بہت کچھ کر رہا ہے!"

<u>مسلمان ایڈیٹروں سے ملاقات</u> : دوسرا واقعہ ۱۹۴۲ء کا ہے۔ لاہور میں
ایک اورینگ ریسٹورنٹ اسی جگہ ہوا کرتا تھا جہاں آج کل ہمارا بلڈنگس میں پی آئی اے
کا دفتر ہے۔ اس ریسٹورنٹ میں با عزم صحافی اور دوسرے دانشور بیٹھا کرتے تھے
یہی وہ جگہ تھی جہاں پر مسلمان ایڈیٹروں کی طرف سے قائداعظمؒ کو چائے کی دعوت
کا اہتمام کیا گیا۔ آپ نے بڑی خوشی سے یہ دعوت قبول کر لی۔ ریسٹورنٹ کے ایک کونے میں

ایک میز کے گرد ہم چھ صحافی بیٹھے تھے۔ مولانا غلام رسول مہر، مولانا اختر علی خان، مولانا عبدالمجید خان سالک، مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش، ملک نور الٰہی اور میں۔ سامنے قائداعظم تشریف فرما تھے۔

قائداعظمؒ نے چائے پیتے ہوئے مسلم اخبارات کے ایڈیٹروں کو یہ یاد دلایا کہ "اس وقت اس برصغیر کے مسلمان ایک نازک ترین دور سے گزر رہے ہیں اور اگر اس موقع پر آپ نے قوم کا ساتھ نہ دیا تو قوم بھی آپ کا ساتھ نہ دے گی۔"

میں نے عرض کیا جہاں تک ہم سے ہو سکتا ہے ہم مسلم لیگ کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ قائداعظمؒ نے کہا "میں سب کچھ جانتا ہوں!"

مولانا غلام رسول مہر نے پنجاب کی صورت حال اور یہاں کے مسلم اخبارات کی مشکلات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن قائداعظمؒ نے ان کی بات کاٹ کر کہا:

"آج ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ لوگ ایثار سے کام لیں اور اگر آپ کسی کے ہاتھ بک جائیں گے تو آپ کسی حال میں بھی قوم کی خدمت نہیں کر سکیں گے۔ زندہ قوموں کے اخبارات کبھی دولت کی خاطر اپنے اصولوں کا سودا نہیں کرتے۔"

میں نے غلطی سے وہ بات کہہ دی جو کسی بھی طرح نہیں کہنی چاہیئے تھی۔ میں نے کہا: "قائداعظم! مسلمان اخبارات کی اشاعت بہت کم ہے اور ہمیں زندہ رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی تدبیر کرنی ہی پڑتی ہے۔ کیا مسلم لیگ انہیں اس سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔"

اس بات پر قائداعظمؒ غضبناک ہو گئے۔ اور زور زور سے میز پر ہاتھ مارنے لگے۔ جس سے میز پر رکھی ہوئی چائے کی پیالیاں اچھلنے لگیں۔ قائداعظم نے بلند آواز میں کہا:

"پاکستان پیش نظر ہے اس ضمن میں مسلم لیگ کسی جماعت یا کسی فرد

وہ ایک کوڑی بھی رشوت نہیں لے گی اور ہم اپنے راستے پر چلتے جائیں گے اور مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت نہیں ہوگی کیونکہ عوام میرے ساتھ ہیں۔

مجھے اپنے سوال پر بہت ندامت ہوئی۔ قائداعظمؒ کو میں خوب جانتا تھا کہ وہ اصولوں کا کبھی سودا نہیں کرتے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے جان بوجھ کر یہ سوال کیا تھا تاکہ انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ بعض مسلم اخبارات سر سکندر حیات کی حکومت سے معقول سالانہ گرانٹ حاصل کر رہے تھے لیکن قائداعظم تو سب کچھ جانتے تھے۔

دوسرے روز ایک مسلم اخبار نے قائداعظمؒ کی اس ترش روئی کے بارے میں ایک نوٹ لکھا جسے باقی تمام اخباروں نے پسندیدہ نگاہ سے نہ دیکھا۔ کیونکہ قائداعظمؒ کا ایک ایک لفظ حقیقت میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ بات تو ان کے مخالفین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نہ تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں خرید سکی اور نہ ہی وہ کسی کو خریدنا چاہتے تھے۔

وقار انبالوی

کرپس مشن کی آمد پر

قائد اعظم سے ملاقات اور گفتگو کا ایک یادگار موقع مجھے کرپس مشن کی آمد پر اپریل ۱۹۴۲ء میں نصیب ہوا جب آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد میں پنجاب کی طرف سے سید مصطفیٰ شاہ گیلانی اور میں مسلم لیگ کونسل کے ممبر کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ اجلاس سے پہلے نواب سر محمد یوسف کے مکان پر کونسل کے جلسہ میں اس قرارداد پر بحث ہوئی جس کی رو سے قائد اعظم کرپس اسکیم کو منظور کرنے یا رد کرنے کا اختیار آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس عام میں حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مولانا حسرت موہانی نے بعض وجوہ سے اس "اختیار خاص" پر اعتراضات شروع کر دیئے۔ ان کا سب سے بنیادی اعتراض یہ تھا کہ کرپس اسکیم کی رو سے جو کچھ ملنے کی توقع ہے وہ یا تو چند علاقوں کی پوزیشن ہوگی یا اس کا درجہ نوآبادیاتی (ڈومینین) ہوگا لیکن مسلم لیگ کا نصب العین "پوری آزادی" ہے۔ اس لیے کرپس اسکیم ہمارے نصب العین کے مطابق نہیں۔ ہم اسے نامنظور کرنے کا اختیار تو قائد اعظم کو دے سکتے ہیں، منظور کرنے کا نہیں۔

اس پر لاری صاحب نے مولانا حسرت موہانی کا جواب دینے کے بجائے ان کا مضحکہ اڑانا شروع کر دیا کہ آپ مولانا سٹھیا گئے ہیں۔ میں نے اور گیلانی صاحب نے بیک وقت لاری کو ٹوکا کہ مولانا کی ذات کا احترام ملحوظ رکھیے۔ اس اثنا میں قائد اعظم

تشریف لے آئے۔ لاری صاحب اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ اور ہم نے ان کے بیچ
کی شکایت قائد اعظمؒ سے کی۔ اس پر قائد اعظمؒ نے مولانا حسرت موہانی کو مخاطب کر کے
کہا کہ آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، بڑی خوشی سے کہیئے۔ مولانا نے اپنے اعتراضات پیش
فرمائے تو قائد اعظمؒ نے لاری صاحب کے انداز پر معذرت کرتے ہوئے مولانا حسرت
موہانی سے کہا کہ قطعی میرے اختیار خاص کا اتنا نہیں جتنا مسلم قوم کی واحد نمائندگی کا ہے
اب تک کرپس، کانگریس اور سکھ لیڈروں سے گفتگو کر چکے ہیں۔ بظاہر تو کانگریس کے
صدر مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ لیکن ان پر بھی اعتماد نہیں کیا گیا۔ ان کے ساتھ جواہر لال نہرو
اور دوسرے کانگریسی لیڈر بھی تھے اور کرپس صاحب یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ کانگریس کا اصل
اور با اختیار لیڈر کون ہے۔ اسی طرح جب سکھ لیڈروں کو بلایا گیا تو ماسٹر تارا سنگھ کے
علاوہ دوسرے سکھ لیڈر بھی آگئے۔ میں کرپس پر یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلمان
ایک قوم ہیں ان کی ایک ہی نمائندہ جماعت ہے۔ اس کا ایک پلیٹ فارم اور ایک
پروگرام ہے اور ایک ہی لیڈر ہے کیونکہ وہ سب ایک رب کے ماننے والے ہیں۔ آپ
چاہیں تو اپنا اعتراض واپس لے لیں ورنہ کونسل میں رائے شماری کرا لیں۔ چنانچہ رائے
شماری پر مولانا حسرت موہانی کی تجویز رہ گئی۔ اور جو تجویز کونسل میں رہ جائے اس پر اجلاس
عام میں بحث نہیں ہو سکتی۔ لیکن جب کھلا اجلاس شروع ہوا۔ تو قائد اعظمؒ نے ایجنڈے پر
نظر ڈالنے کے بعد مولانا حسرت موہانی کو آواز دی۔ اور کہا کہ کونسل میں جو بدمزگی ہوئی
تھی مجھے اس پر افسوس ہے۔ میں آپ کو پانچ منٹ کے لیے اپنی تجویز پر بات کرنے
کی اجازت دیتا ہوں۔ چنانچہ مولانا نے اپنے اعتراضات پھر بیان کیے لیکن قائد اعظمؒ
کی دلیل کے سامنے (جو وہ کونسل میں بھی پیش کر چکے تھے) مولانا کی تجویز اس عام اجلاس
میں بھی رہ گئی۔ اس واقعہ سے قائد اعظمؒ کی فراخدلی، اعلیٰ ظرفی اور جمہوریت پسندی کا
مجھ پر بہت اچھا اثر پڑا۔

مسلمان ایڈیٹروں کی کانفرنس:

قائد اعظمؒ سے ایک اور ملاقات کا موقع

مئی ۱۹۴۷ء میں میسر آیا جب انہوں نے دہلی میں مسلم اخبارات کے ایڈیٹروں کو طلب فرمایا
پنجاب سے میں، حمید نظامی اور مولانا اختر علی خان اکٹھے گئے۔ اور راجہ غضنفر علی خان کے
بنگلے پر ٹھہرے۔ جو ان دنوں عبوری حکومت میں وزیر تھے۔ اگلے دن امپیریل ہوٹل میں
قائداعظمؒ نے اس فقرے سے اپنا خطاب شروع کیا۔

"دوستو! ہم اس وقت پاکستان کی دہلیز پر ہیں۔ کوئی دن آیا چاہتا ہے کہ آپ
قیام پاکستان کی نوید سنیں گے۔" حاضرین کے چہرے فرطِ مسرت سے کھل اٹھے۔ لیکن
قائداعظمؒ کے چہرے پر ضعف کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ میں نے حمید نظامی سے
کہا۔ "چراغ کی روشنی مدھم پڑ رہی ہے۔ قائداعظمؒ کو اپنی صحت بحال کرنے کے لیے
آرام کا مشورہ دینا چاہیے۔"

اس کے بعد ہم نے قائداعظمؒ سے باری باری بہت سے سوال کیے۔ جب میں نے
پنجاب کی تقسیم کے بارے میں پوچھا تو آپ نے کہا کہ پنجاب کے ہر انچ کے لیے میری لڑائی
تو جاری ہے لیکن تقسیم اکثریت کی بنا پر عمل میں آ رہی ہے۔ آخر میں جب حمید نظامی
نے پوچھا کہ پنجاب کے لیے آپ ہمیں کیا پیغام دیتے ہیں؟ تو قائداعظمؒ نے فوراً فرمایا
"کام... کام اور کام!" اس کے بعد انہیں آرام کا مشورہ دینے کی جرأت کسے تھی۔

محمد احسن نصیری

آزادیٔ تنقید

دسمبر ۱۹۴۳ء کے اوائل تک مجھے کانگریسی خیالات سے ہمدردی تھی۔ میں انڈین آرمی میں ملازم تھا۔ اپنی ملازمت کے دوران چند دستاویزات میری نظر سے گزریں جن کا تعلق ہندوؤں کی جماعت راشٹریہ سیوک سنگھ کے ان ناپاک عزائم سے تھا جو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف تیار کیے تھے۔ یہ دستاویزات پڑھ کر مجھے کانگریس اور ہندوؤں سے سخت نفرت ہو گئی۔ میں نے ذاتی مجبوریوں کی آڑ لے کر فوج سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور فیصلہ کیا کہ قائداعظم کے معتمد نوابزادہ لیاقت علی خان سے رابطہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ نوابزادہ لیاقت علی خان نے مجھے بتایا کہ قائداعظم چاہتے ہیں کہ تم "ڈان" میں ملازمت کر لو۔ اس وقت "ڈان" میں زیادہ تر عیسائی کام کر رہے تھے۔ صرف تین چار مسلمان صحافی تھے چنانچہ میں نے ڈان میں رپورٹر کے طور پر کام شروع کر دیا۔

چند روز بعد آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے موقع پر قائداعظم سے ملاقات کا موقع ملا تو وہ یہ سن کر بے حد خوش ہوئے کہ میں نے "ڈان" میں کام شروع کر دیا ہے۔ فرمانے لگے "صحافت بڑا ذمہ دارانہ پیشہ ہے۔ اس میں ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ ہر مسئلہ کا بھی اچھی طرح مطالعہ کریں۔ اس کے بعد اس پر اظہار خیال کیا جائے اس وقت ملک کسی دوسرے کا محکوم [illegible] رہنا چاہیے جب ملک کے اخبار کی طرح کا

ڈال جائے۔ اور جب پوری طرح مطمئن ہو جاؤ تو اپنے مطالعے اور ضمیر کے مطابق اس پر اپنا خیال کرو۔ کسی پر نکتہ چینی کرنے یا کسی کی تعریف کرنے میں کسی قسم کا تامل اور خوف نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر تم دیانتداری سے کسی پر نکتہ چینی کرنا چاہتے ہو تو ضرور کرو، خواہ وہ تمہارا قائداعظم ہی کیوں نہ ہو۔

عوامی عطیات اور احتیاط :

روپے پیسے بالخصوص قومی عطیات کے بارے میں قائداعظمؒ کس قدر محتاط تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ قائداعظمؒ نے جب قوم سے اپیل کی کہ مجھے چاندی کی گولیاں (روپے) چاہئیں تو میں اور الطاف حسین صاحب ایڈیٹر ڈان "قائداعظمؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم نے عرض کیا کہ ہم "ڈان" کے ذریعے چندے کی اپیل کرتے ہیں۔ قائداعظمؒ نے مجھے منع فرما دیا اور کہا "نہیں یہ نہیں کرو۔ (حالانکہ ہندو اخبارات کانگریس کے لیے چندہ جمع کرتے تھے اور فہرستیں چھاپ دیتے تھے) اگر مسلم لیگ چندہ دینے والوں کی فہرست نہیں چھپے تو مرے دماغ چھاپ دینا لیکن کبھی براہ راست چندہ نہ منگانا۔ تم اس قوم کے مزاج کو نہیں سمجھتے۔ یہ تو وہ قوم ہے جس نے مولانا محمد علی جوہر کو بھی بدنام کر دیا تھا کہ قوم کے پیسے کھا گئے۔ اور کوئی ذکی شخص یہ کہہ رہا تھا بلکہ نیشنلسٹ مسلمان اس بات کو ضرور ہوا دیں گے کہ قوم کا پیسہ سب کہاں جا رہا ہے۔"

خود قائداعظم بھی چندہ کو ہاتھ نہ لگاتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ بینک کے ذریعے اسے وصول کرتے تھے۔

قائداعظمؒ حریت پسندی، نڈر اور آزادئ خیال کے کتنے بڑے علمبردار تھے اس کا ایک چشم دید واقعہ بھی سنئے۔

امپیریل ہوٹل دہلی میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہو رہا تھا۔ مولانا حسرت موہانی جو ہمیشہ سب سے بے لاگ اور بے باکانہ انداز میں بات کیا کرتے تھے اور کسی کی پرواہ نہیں کیا کرتے تھے اجلاس میں شریک تھے۔ ابھی قائداعظمؒ نے اپنی نشست سنبھالی ہی تھی

سنے۔ مولانا "نقطۂ اعتراض" (پوائنٹ آف آرڈر) کہہ کر کھڑے ہو گئے۔ لوگوں نے
انھیں بٹھانا چاہا۔ لیکن قائداعظمؒ نے سب کو روک دیا۔ اور کہا کہ انھیں اپنا اعتراض
بیان کرنے دیں۔ آخر قائداعظمؒ نے ان کی بات سن کر فیصلہ دیا کہ آپ غیر متعلق بات
کر رہے ہیں۔

اب ایک اور واقعہ بھی سن لیجیے۔ عبوری حکومت میں لارڈ ویول نے مسلم لیگ سے
نقطۂ نظر سے اتفاق نہ کر کے کانگریس کی بات مان لی اور کانگریس کو اپنی کابینہ میں شامل کر لیا
مسلم لیگ نے اس کے خلاف راست اقدام کیا۔ ڈان نے حکومت ہند کے خلاف بہت
ہنگامہ کیا اور مطالبہ کیا کہ مسلم لیگ کو اطلاعات اور کوئی اہم وزارت دی جائے۔ لیکن دو ماہ
کی مسلسل گفت و شنید کے بعد ایک دن وہ آیا کہ وزارت داخلہ، وزارت خارجہ اور وزارت
اطلاعات کے حصول کے بغیر ہی مسلم لیگ نے عارضی حکومت میں شرکت کا فیصلہ کر لیا۔
یہ وقت ڈان والوں کے لیے بہت سخت تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب اس سلسلے میں
کیا لکھیں۔ کس طرح اپنے پچھلے نقطۂ نظر سے انحراف کریں۔ ہمارے ایڈیٹر الطاف حسین کو
محسوس ہو رہا تھا جیسے مسلم لیگ کو شکست ہو گئی ہے۔ وہ بے حد مغموم اور مشتعل تھے۔
انھوں نے مجھ سے کہا، چلو جا کر ان سے پوچھتے ہیں کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے
کیا حکم ہے ہمارے لیے؟

چنانچہ ہم دونوں ۱۰ اورنگ زیب روڈ پہنچے۔ کوئی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کا وقت
تھا۔ قائداعظمؒ نے ہم دونوں کا منہ لٹکا ہوا دیکھا تو پوچھا کیا بات ہے؟ الطاف حسین
نے کہا کہ دیکھیے ہمیں وزارت اطلاعات ملی نہ وزارت داخلہ! جو میں چاہتا تھا وہی ہوا
قائداعظمؒ مسکرائے اور فرمایا "ہمیں وزارت خزانہ ملی ہے اور اگر ہم نے مزید کچھ کیا تو ہم
ہندوستان کی ساری حکومت کو مفلوج کر سکتے ہیں۔" تب ہمیں یہ احساس ہوا کہ ان
کی اجازت کے بغیر تو ایک چپراسی بھی مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت تک یہ دماغ
میں بھی نہیں آیا تھا کہ وزارت خزانہ کی کتنی طاقت ہے۔ ہم خوش خوش واپس آئے اور
معلوم ہوا کہ جب لیاقت علی خان باقاعدہ طور پر وزارت خزانہ کا چارج لے لیں، اخبار

لیگ ایک لفظ بھی اس سلسلے میں نہ کہی جائے۔ مبادا ہندو اپنی رائے بدل دیں۔ اس کے بعد ہی مسلمانوں کو اس وزارت اور اہمیت کے بارے میں کچھ بتایا جائے گا۔ چنانچہ سب کو یاد ہوگا کہ جب لیاقت علی خان نے اپنا پہلا بجٹ پیش کیا تو پورے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا ہندوستان بھر کے ہندو تاجروں میں کھلبلی مچ گئی اور خود کانگرسی لیڈروں کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔

مولوی محمد حسن عقیل

غازی علم الدینؒ کے مقدمے میں

میں نے پہلے پہل قائد اعظمؒ کو ۱۹۲۹ء میں دیکھا۔ وہ ان دنوں غازی علم الدین کے مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں لاہور تشریف لائے تھے۔ یہ مقدمہ زیریں عدالتوں سے ہوتا ہوا ہائیکورٹ تک جا پہنچا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کچھ متعصب اور تنگ نظر ہندو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو اپنی گندی تحریروں کا موضوع بنا رہے تھے۔ حضورؐ کے بارے میں مستشرقین کی نام نہاد تحقیقات کو سماجی پرچارک ہر جلسے میں اچھالتے پھرتے تھے۔ ہندو مصنفین کتابوں اور رسالوں کے صفحوں کو شب و روز سیاہ کرتے رہتے تھے۔ اس تحریک سے خوف مسلمانوں کی جانب سے رواداری کی تمام اپیلیں بے اثر ثابت ہو رہی تھیں۔ حضورؐ پر کیچڑ اچھالنے کی انفرادی کوششیں جب ایک ناپاک تحریک کی صورت اختیار کر گئیں تو فدایان رسولؐ میں سے چند لوگوں نے اس کے سدباب کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ دلی میں غازی عبدالرشید نے سوامی شردھا نند کو، کراچی میں غازی عبدالقیوم نے "پراچین کہانی" کے مصنف کو اور لاہور میں غازی علم الدین نے راجپال کو قتل کر کے اس تحریک کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا۔ راجپال رسوائے عالم کتاب "رنگیلا رسول" کا ناشر تھا اور پبلشر بھی۔ ایک مدت پہلے جب لاہور کی گرمی اپنے شباب پر تھی اور گھوڑا بازار سے نکلے۔ علم الدین اندرون شہر سے ہسپتال روڈ تک آیا۔ اس نے راجپال کو بیٹھے دیکھا

اور جب وہ آگے بڑھا تو راجپال سہم گیا، لیکن پیشتر اس کے کہ وہ مدافعت کرتا علم الدین کا خنجر اس کے جگر سے پار اتر چکا تھا۔ خون فوارے کی صورت بہتا چھوڑ کر یہ نوجوان خراماں خراماں ٹکسالی کے دروازوں تک چلا گیا لیکن یک لخت اس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ کہیں بچا نہ پڑا ہو اور کہیں پھر نہ بچ نکلے (ایک دو مرتبہ وہ ایسے ہی حملوں سے بچ نکلا تھا) اس بات کے اطمینان کے لیے وہ لوٹا اور گرفتار کر لیا گیا۔

قتل کا مقدمہ چلا اور سیشن جج نے پھانسی کی سزا دی۔ ہائیکورٹ میں اپیل ہوئی۔ پورا ہندو پریس اور ہندو جماعتیں اس مقدمے کو اچھال رہی تھیں۔ چنانچہ مقدمہ کی سیاسی اور مذہبی نوعیت اور مسٹر جناح جیسے فاضل بیرسٹر کی آمد کے پیش نظر عدالت کے احاطے میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ لیکن سڑک پر زبردست ہجوم جمع ہو رہا تھا۔ اس ہجوم میں آہنی جنگلے کے ساتھ مجھے بھی قدم رکھنے کی جگہ مل گئی۔ ہم مسٹر جناح کی آمد کے منتظر تھے کہ یکدم آواز آئی "جناح آ رہے ہیں" ہم جنگلے کے ساتھ ذرا اور اونچے ہو گئے۔ دور سے دیکھا کہ برآمدوں میں جمع ہونے والے لوگ اپنے درمیان کا راستہ چھوڑ رہے ہیں اور کشیدہ قامت وجیہہ جناح سیاہ گون میں ملبوس بڑے وقار کے ساتھ عدالت کے کمرے کی جانب جا رہے ہیں۔ ان کے پیچھے علم الدین کے والد صاحب میاں طالع مند تھے انہوں نے ایک سیاہ رنگ کی صندوقچی اٹھا رکھی تھی۔

عدالت کے کمرے تک ہماری رسائی نہ تھی کیونکہ وہاں صوبے بھر کے نامور وکلا کا ہجوم تھا لیکن اگلے روز مقدمے کی جو کارروائی اخبارات میں چھپی اس سے معلوم ہوتا تھا کہ مسٹر جناح نے زیریں عدالت کے فیصلے اور گواہوں کے بیانات کے پرخچے اڑا دیے ہیں۔ پوری رودادِ عدالت میں عاشقانِ رسول کے لیے تازگی ایمان کا بڑا سامان تھا۔ لاہور کے قانونی حلقوں میں تہلکہ مچ گیا۔ مسٹر جناح کی تقریر نکتہ آفرینی اور اسلوب بیان کا شاہکار تھی۔ انگریز جج نے بہرکیف وہی فیصلہ دیا جو متوقع تھا۔ علم دین کی سزائے موت بحال رہی۔

قائداعظم اکثر لاہور آتے جاتے رہتے تھے۔ مسجد شہید گنج کے قضیے میں بھی مسلمانانِ لاہور کی نگاہیں انہی کی جانب اٹھیں۔ جہاں آج کل لاہور ریلوے اسٹیشن

تھا کہ قائداعظمؒ کا ذکر نکل آئے۔ ناشیر کہنے لگا کہ میں ایک عرصہ سے مسٹر جناح کی سیاست کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ ایک وقت ایسا آیا کہ میرے قلب میں ان کے خلاف غم و غصہ کے علاوہ کئی ٹھوس سوال بھی ابھرے۔ چنانچہ میں نے اسی عالم میں انہیں ایک خط لکھا اور ملاقات کے لیے وقت مانگا۔ اس خط کا جواب فوراً آ گیا۔ دن اور وقت مقرر ہوا۔ میں گیا۔ قائداعظمؒ بڑے تپاک سے ملے۔ چہرے پر مسکراہٹ تھی اور مصافحہ میں گرمجوشی۔ اس سے میری وہ بدگمانی تو دور ہو گئی کہ قائداعظمؒ بڑے مغرور اور سرد مہر ہیں۔ لیکن سوالات بدستور دماغ میں ہجوم کیے ہوئے تھے۔ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

قائداعظمؒ نے بڑی دلچسپی اور فراخدلی سے ایک ایک سوال کا جواب دیا اور پھر بڑے دکھ سے کہا: "مسٹر ناشیر! میں کانگریس میں کس سے بات کروں۔ سب لوگ گاندھی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اور گاندھی جی یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ میں تو کانگریس کا چار آنے کا ممبر بھی نہیں ہوں؟"

مسٹر ناشیر بھی کانگریس کی اس حیلہ جوئی سے بہت نالاں تھے۔ انہوں نے کہا کہ قائدؒ کی گفتگو بڑی ٹھوس اور حقائق پر مبنی تھی۔ جب وہ قائدؒ سے رخصت ہوئے تو ان کے قلب پر سے شکوک و شبہات کا غبار دھل چکا تھا اور اس جگہ قائدؒ کی عظمت کا نقش ثبت ہو چکا تھا۔

حاجی حسن علی ابراہیم

خدمت کا جذبہ

قائد اعظم بیرسٹر تھے۔ ان کی بہت زبردست کی پریکٹس تھی۔ سال میں لاکھوں کی آمدنی ہوتی
مسلمانوں اور پاکستان کی خاطر انہوں نے پریکٹس چھوڑ دی۔ وہ اپنے کسی عزیز یا رشتہ دار سے
نہیں ملتے تھے۔ انہیں صرف حصول پاکستان کی دھن تھی۔ مسلمانوں کے خلوص کا معاملہ تو تھا ہی
اور ان کی نیک نیتی کا ہی نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیابی بخشی اور ان کی مساعی سے
انہی کی زندگی میں اور ان کے ہاتھوں پاکستان بن گیا۔

بمبئی سے جب آخری بار دلی جانے لگے تو میں نے کہا "صاحب! آپ کہیں تو میں آپ
کی حفاظت کے لیے پولیس گارڈ کا انتظام کر دوں!" فرمایا "مجھے پولیس کی کوئی ضرورت
نہیں۔" میں نے کہا تو میں چاہتا ہوں کہ آپ میری موٹر میں جائیں۔ اس بات کو انہوں نے مان
لیا اور میں اس پر آج تک بہت خوش ہوں کہ قائد اعظمؒ اور محترمہ فاطمہ جناح آخری مرتبہ
بمبئی سے میری موٹر میں گئے اور ان کی بچی موٹر میں ان کا سامان بھیجا گیا۔ ان سے بمبئی میں
میری یہ آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد ان سے دہلی میں ملاقات ہوئی۔ اس میں ہندوستان
کی آزادی پر (۱۵ اگست کو) مسلمانوں کی طرف سے جھنڈا لگانے کے سلسلے میں تھی۔
مسلمان کہتے تھے کہ مسلم لیگ کا پرچم لگایا جائے۔ مگر کانگریس کہتی تھی کہ ترنگا چکروالا
جھنڈا لگایا جائے۔ جب بات نے طول کھینچا تو بڑا تعجب ہوا کہ مرارجی ڈیسائی نے

تجویز پیش کی گئی کہ آدھے جھنڈے مسلم لیگ کے اور آدھے کانگریس کے لگائے جائیں
میں یہ فیصلہ کر کے دہلی گیا۔ قائداعظم نے صبح ۹ بجے ملاقات کا وقت دیا۔ میں پہنچا تو وہ
محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ نشست پر تھے۔ مجھے بلا لیا۔ میں نے مدعا بیان کیا تو فرمانے لگے کہ "نہیں
مسلم لیگ کے نہیں، سارے جھنڈے کانگریس کے لگائے جائیں۔" ادھر محترمہ فاطمہ
جناح نے فرمایا کہ "نہیں، سارے پرچم مسلم لیگ کے لگائے جائیں۔" مگر قائداعظم
نے پھر فرمایا کہ جو بھی مسلمان ہندوستان میں رہ جائے گا ان کو چاہیے کہ وہ اپنے
ملک کی حکومت کے وفادار بن کر رہیں۔" بہن بھائی کی اس بحث میں میں کیا بول سکتا
تھا۔ جب معاملہ ذرا دھیما ہوا تو میں نے کہا کہ میں سارے مسلم لیگی یا سارے کانگریسی
پرچموں کے خلاف ہوں۔ میں نے مرارجی ڈیسائی سے نصف نصف پر سمجھوتہ کر لیا ہے
یہ فیصلہ مناسب ہے۔ اس طرح جھگڑا فساد نہ ہو سکے گا۔ اس پر قائد نے فرمایا کہ تم موقع
پر موجود ہو اور جیسے مناسب سمجھو ویسا ہی کر لینا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور چلا آیا۔

قائداعظم قیام پاکستان پر بہت خوش تھے مگر ان کو اس بات کا شدید احساس
تھا کہ پاکستان تو حاصل کر لیا لیکن اس وطن کی تعمیر اس کے حصول سے زیادہ مشکل ہے
جب پاکستان کی تحریک زوروں پر تھی تو سب پوچھتے تھے کہ پاکستان کا آئین کیا
ہوگا؟ قائداعظم اس بات کی اہمیت کو سمجھتے تھے لیکن بڑی صفائی اور تدبر سے
کہتے تھے کہ بھائی پاکستان بن جانے دو سب کچھ ہوگا۔ جیسا تم چاہو گے ویسا ہو
جائے گا۔"

پاکستان بننے کے بعد میری قائداعظم سے چند ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں سے ایک
ملاقات کراچی میں ہوئی جس میں برصغیر کی تقسیم پر گفتگو ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ
"آپ نے کیبنٹ مشن منظور کر کے پاکستان کیوں منظور کیا یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟"
موصوف نے فرمایا کہ لڑائی اقتصادی ہوتی ہے اور اقتصادی برتری ہی کامیاب بناتی
ہے۔ مسلم لیگ نے جب ان علاقوں میں اقتصادی نظام ہاتھ کا سارا ہندوؤں
کے ہاتھ میں تھا۔ بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی معمولی اکثریت تھی اور صوبہ سرحد

پیچھے سے چند مسلمانوں کو ڈرا کر اپنی اکثریت بنا لیتے۔ جس طرح پاکستان بن بھی جاتا
تب بھی اکثریت اور حکومت ہندوؤں ہی کی رہتی۔ قائدِ اعظمؒ نے سندھ کی مثال
دیتے ہوئے بتایا کہ سندھ میں ۸۰ فیصد مسلمان اور بیس فیصد ہندو ہیں لیکن ٹیکس
اسّی فیصد ہندو اور بیس فیصد مسلمان ادا کرتے ہیں۔"

اسی زمانے کا ایک واقعہ سنیئے۔ خالقدینا ہال کراچی میں مسلم لیگ کی تقسیم کا
جلسہ تھا۔ اس اجلاس میں ایک دو آدمیوں نے قائدِ اعظمؒ سے کہا کہ "آپ ہندوستان
کے مسلمانوں کو چھوڑ کر آ گئے ہیں۔ ان پر زیادتیاں ہو رہی ہیں۔ اس وقت آپ کو
وہاں جا کر ان کی رہنمائی کرنی چاہیئے۔"

اس پر قائدِ اعظمؒ نے جواب دیا: "اگر آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں
میری زیادہ ضرورت ہے اور پاکستان کا انتظام آپ لوگ خود سنبھال سکتے ہیں تو
میں ہندوستان جا کر مسلمانوں کی خدمت کرنے کو تیار ہوں۔"

یہ مسئلہ ورکنگ کمیٹی میں پیش کیا گیا تو اس نے فیصلہ کیا۔ "پاکستان میں قائدِ اعظمؒ
کی بہت زیادہ ضرورت ہے اور قائدِ اعظمؒ کو یہیں رہنا چاہیئے۔"

حنیف شیاد

طلباء کی تربیت

قائد اعظمؒ سے پہلی بار ۱۹۳۶ء میں ملا۔ اس وقت لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہونے والا تھا۔ محسن کے ساتھ مندوبین ان سے ملاقات کے لیے ان کے گھر گئے تھے۔ میں اس سے پہلے بھی اپنے والد کے ساتھ ایک دو مرتبہ ان کے گھر گیا تھا۔ میرے والد چونکہ لیگ میں تھے ان سے ملنے جایا کرتے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں عید کی نماز کے لیے قائد اعظمؒ میرے والد کے ساتھ گئے۔ اور ہم نے [illegible] مسجد میں عید کی نماز ادا کی۔

طلبہ کے ساتھ ان کا رویہ ہمیشہ مربیانہ اور مشفقانہ ہوتا تھا۔ جب بھی طلبہ آتے قائد اعظمؒ انہیں خوش آمدید کہتے، بڑی محبت سے پیش آتے اور کوشش کرتے کہ انہیں مسلمانوں کے نظریے اور ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کریں۔

یہ حقیقت ہے کہ قائد اعظمؒ اتنے سخت مزاج ہرگز نہ تھے جتنا بعض لوگوں نے انہیں مشہور کر رکھا ہے۔ وہ بہت مزاح اور خوش خلق انسان تھے۔ نظم و ضبط کے پابند اور اکثر کہتے جب تک مسلمان قوم میں نظم و ضبط ہوتی ہے وہ پھلے پھولے گی اور ترقی کرے گی۔

ہمارے زمانے میں عام نوجوانوں کا یہ خیال تھا کہ مسلم لیگ نوابوں اور امیروں کی جماعت ہے۔ عام لوگ اس میں شامل نہیں ہو سکتے۔ اصل میں کانگریس کے کارکن مسلم لیگ کے خلاف ایسے پروپیگنڈہ کے ذریعے نوجوانوں کو اس جماعت سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ ایک حد تک

وہ اس مہم میں کامیاب بھی ہوئے۔

ہم لوگوں نے بمبئی میں ایک اسکول قائم کیا اور چلایا۔ میرے والد اس اسکول کے بانی تھے۔ اسکول کی ابتدا پہلی اور دوسری جماعت سے کی گئی۔ جب قائد اعظمؒ وہاں تشریف لائے تو بہت خوش ہوئے اور کہا کہ "میں اسی طرح کا کام چاہتا ہوں۔" آہستہ آہستہ اسکول بڑا ہوتا گیا اور اسے بڑے لوگوں کی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی۔ اب مسلم لیگ کے بارے میں طلبہ کے خیالات میں تبدیلی آنے لگی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قائد اعظمؒ ذاتی طور پر طلبہ سے مل کر ان کے شکوک دور کرتے، اور ان کی سیاسی تربیت پر اپنا قیمتی وقت صرف کرتے تھے۔

۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ نے راست اقدام کی تجویز منظور کی تو فیصلہ کیا گیا کہ ہڑتال کی جائے اور کام بند کر دیا جائے۔ طلبہ نے کہا کہ ہم جلسے کر کے لوگوں کو بتائیں گے کہ ایسا کیوں کیا جا رہا ہے۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ ایک بہت بڑا جلوس نکالا جائے۔ ان دنوں شہر میں دفعہ ۱۴۴ لگی ہوئی تھی اور قائد اعظمؒ سے یہ دریافت کرنا تھا کہ اس کی خلاف ورزی کی جائے یا نہیں۔ ہم لوگ قائد اعظمؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہدایت طلب کی تو انھوں نے کہا: "تم لوگ بچے نہیں ہو کہ میں تمہیں ترکیب سے منع کر دوں۔ تم سمجھدار ہو، برا بھلا سوچ سکتے ہو۔ جو چاہتے ہو فیصلہ کرو۔" چنانچہ ہم لوگوں نے جلسے کیے جو بہت کامیاب رہے۔

بعد ازاں مسلم طلبہ نے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن بنائی جس سے طالب علموں میں کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ طالب علم جمع ہوتے، بحث کرتے، لوگوں کے گھروں میں جا کر مسلم لیگ کے حق میں بات کرتے اور بتاتے کہ مسلم لیگ کا نقطۂ نظر اور نظریہ کیا ہے اور کیا کرنا چاہتی ہے؟

قائد اعظمؒ قانون دان تھے اس لیے وہ آئین اور قانون کے سخت پابند تھے۔ چنانچہ جب ہندو مسلم ہنگامے ہوئے تو انھوں نے مسلمانوں بالخصوص نوجوانوں کو اس بات پر کبھی نہیں اکسایا کہ ہندوؤں سے انتقام لیا جائے۔ وہ یہی کہتے: "اپنی حفاظت کرو۔ اگر مسلمان زخمی ہو گیا ہے تو اسپتال جا کر اس کی خیریت معلوم کرو۔ دیکھو کہ دوا وغیرہ ملتی ہے یا نہیں۔" اگر کسی فساد میں کوئی مسلمان جاں بحق ہو جاتا تو ہم لوگ اس کے گھر پر جا کر راشن وغیرہ پہنچاتے

ہم نے بمبئی میں ایک ڈیفنس سوسائٹی بنائی تھی۔ جب کوئی مسلمان گرفتار ہو جاتا تو ہم سوسائٹی
کی طرف سے مقدمات کی پیروی کرتے۔

وہ زمانہ بڑا عجیب تھا۔ مسلمانوں کی کوئی خبر شائع نہ ہوتی۔ مسلمانوں کا اپنا کوئی اخبار نہیں
تھا۔ ہندو مسلم فساد میں مسلمان مارے جاتے تو ان کی موت کی خبر تک ہندو اخباروں میں
شائع نہ ہوتی چنانچہ ہم لوگوں نے ایک چھوٹا سا اخبار جاری کیا تاکہ مسلمانوں کی خبریں
لوگوں تک پہنچ سکیں۔ بمبئی کے ایک پارک میں ہم لوگ جمع ہوتے اور وہیں وہ پرچہ تقسیم
ہوتا۔ ایک نسخہ ہم قائداعظمؒ کو بھیج دیا کرتے تھے۔

۱۹۴۶ء میں شملہ کانفرنس کے بعد قائد اعظمؒ نے میرے والد صاحب سے کہا۔
"محمد علی ہمیں اب روپے کی ضرورت ہے" تو والد صاحب نے فوراً لوگوں سے رابطہ کیا
اور قائداعظمؒ سے کہا کہ "صاحب میں نے ایک لاکھ روپیہ جمع کر لیا ہے"۔ چنانچہ قیصر باغ
میں مسلم لیگ کا جلسہ کیا گیا اور وہ تھیلی قائد اعظمؒ کو پیش کر دی گئی۔ اس کے بعد چار
لاکھ روپے کا ہدف دیا گیا تھا وہ بھی جمع کر دیا گیا۔ اس کے بعد بہار فنڈ کے لیے والد صاحب
نے چھ یا سات لاکھ روپیہ جمع کیا۔ ٹوٹل تقریباً بتیس یا تینتیس لاکھ روپیہ جمع ہوا تھا۔
بہار فنڈ کے لیے قائداعظمؒ میرے والد سے جتنا روپیہ جمع کرنے کے لیے فرماتے تھے وہ
مقررہ وقت کے اندر اندر اتنی رقم بمبئی کے مسلمانوں سے مل کر جمع کر لیتے تھے اور
قائداعظمؒ کی خدمت میں پیش کر دیا کرتے تھے۔

جہاں تک فنڈ کا تعلق ہے اس بارے میں قائداعظمؒ ہمیشہ یہی کہتے کہ یہ مسلمانوں
کا پیسہ ہے اس کی پوری حفاظت کرو۔ بہار فنڈ کے زمانے میں جب طلباء کی طرف سے
ایک ایک روپیہ چندہ آتا تو وہ میرے والد سے کہتے "محمد علی! یہ ایک روپیہ جو کسی بچے
نے بھیجا ہے یہ ایک سو کے برابر ہے" وہ لینے سے چھوٹوں بالخصوص نوجوانوں کی بہت
قدر کرتے اور ان کی بے حد حوصلہ افزائی کرتے۔

محمود ہارون

کراچی کا جلوس

میں سولہ سال کا تھا تو مسلم لیگ نیشنل گارڈ میں شامل ہو گیا۔ میں مستقل طور پر مسلم لیگ کا جیالا بن کر سیاست میں حصہ لیا۔ قائداعظمؒ سے میری پہلی ملاقات اگلے سال کراچی میں اپنے رہبر ہوئی۔ مسلم لیگ کا اجلاس سندھ میں طلب کی گئی تھی اور کراچی میں اس کا جلاس ہوا تھا قائداعظمؒ نے اس کی صدارت فرمائی تھی۔ پنڈال کالے رنگ کی سی مقرر ہوا تھا۔ کانفرنس عید گاہ میدان میں ہوئی۔ کراچی میں قائداعظمؒ کا جلوس بڑے شاندار طریقے سے نکالا گیا۔ ایسا عظیم الشان جلوس اب تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ آٹھ سفید گھوڑوں کی گاڑی پر قائداعظمؒ کو بٹھایا گیا۔ لاکھوں کا مجمع ان کے استقبال کے لیے موجود تھا۔

قائداعظمؒ جب بھی کسی سے ملتے تو بڑی محبت سے ملنے والے یہ محسوس کرانے کی کوشش کرتے کہ ملاقاتی ان کے برابر کا ہے کسی صورت کمتر نہیں۔ جب وہ کسی مسئلہ پر بات کرتے تھے تو ایسے دلنشین انداز میں کہتے کہ انسان ان کا ہم خیال بن جاتا اور ان کے کہنے کے مطابق عمل پر تیار ہو جاتا۔ ان کی دیانتداری اور خلوص سے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ قائداعظمؒ کا روز مرہ کا معمول تھا کہ وہ صبح کو جلدی سے اٹھا کرتے۔ پہلے اخبار پڑھتے۔ اس کے بعد ان کی ملاقاتیں شروع ہوتی تھیں رات کو سونے سے پہلے بھی وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک مطالعہ کرتے۔ ان کا لباس سادہ ہوتا، مگر معمولی نہیں ہوتا تھا۔

عبدالرؤف شباب مفتی

جواں ہمت قائد

قائداعظم طلبا کو قوم کا سرمایہ اور نہایت فعال عنصر خیال کرتے اور ان سے خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہیں بھی جاتے اور کتنے ہی مصروف ہوتے، طلبا کے لیے وقت ضرور نکالتے۔ تقریب خواہ سیاسی ہو یا غیر سیاسی، اگر طلبا نظر نہ آتے تو قائداعظم ایسی تقریب کو نامکمل سمجھتے۔

قیام پاکستان سے قبل ایک مرتبہ پشاور میں مسلم لیگ کے اجلاس میں طلبہ کو موجود نہ پاکر قائداعظم نے منتظمین سے استفسار کیا۔ چنانچہ دوسرے اجلاس میں اسٹیج کے بالکل قریب طلبا کی نشستوں کا بندوبست کیا گیا۔ بقول سردار عبدالرب نشتر (مرحوم) قائداعظمؒ نے منتظمین کو اس کوتاہی پر سرزنش کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ ایسی غفلت کا اعادہ نہ ہو۔

قائداعظمؒ کو یہ دلچسپی طلبا سے صرف تحریک پاکستان کے زمانے میں ہی نہیں تھی بلکہ اس سے پہلے بھی وہ طلبا کی صلاحیتوں اور بے لوث خدمات کے معترف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ طلبا مستقبل کی ذمہ داریوں سے بطریق احسن عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں۔

قائداعظمؒ نے ایک مرتبہ ممدوٹ ولا لاہور میں طلبا سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:
"اگرچہ میں ستر (۷۰) برس کا بوڑھا ہوں، میرے چہرے پر جھریاں پڑ چکی ہیں مگر میں بے حد مصروف رہتا ہوں۔ ذمہ داریوں کی طویل فہرست ہمیشہ میرے سامنے رہتی ہے۔ اور

بہت سے لوگ جو میری طرح آپ سے بڑے ہیں میری جان کھاتے رہتے ہیں مگر عزیزو! مجھے جو مسرت اور اطمینان آپ سے مل کر حاصل ہوتا ہے اور کہیں نہیں ملتا۔ میں محسوس کرتا ہوں جیسے میں ابھی بیس برس کا نوجوان ہوں۔ چاق و چوبند، مستعد اور توانا۔" اس پر گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک طالب علم نے کہا: "ہمیں آپ سے مل کر ایک روحانی تسکین ولولہ اور جرأت حاصل ہوتی ہے۔ آپ کے تدبر کی وجہ سے خود کو بہت بڑا محسوس کرتے ہیں۔" یہ بات سن کر قائد اعظم مسکرائے۔ اور فرمایا: "آپ لوگوں کے عزم صمیم، نیت کی صداقت اور یقین نے آپ کو اتنی توانائی عطا کر دی ہے جس سے میرا، میری جماعت کا اور ملت اسلامیہ کا متاثر ہونا ایک قدرتی امر ہے۔" اس کے بعد انہوں نے ایک واقعہ سنایا: "۱۹۴۶ میں ایک مرتبہ آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا اجلاس عشائیہ کے لیے آدھی شب ملتوی کیا گیا تو سوال پیدا ہوا کہ آئندہ اجلاس کب منعقد ہوگا؟ کچھ لوگ کہنے لگے کہ سردی بہت ہے لہذا اجلاس صبح تک ملتوی کر دیا جائے۔ بحث لمبی ہو گئی تو میں نے اسے یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ میں نوجوانوں میں ہوں ۹ بجے شب پھر آ دھمکوں گا۔ میں عمر میں اگرچہ آپ سب سے بڑا ہوں مگر جذبے کے اعتبار سے اپنے آپ کو تمہارا ہم عمر سمجھتا ہوں۔

یہ واقعہ سنانے کے بعد آپ نے اسی نوجوان سے پوچھا: "کہاں پڑھتے ہو؟ کیا پڑھتے ہو؟ کیا بننے کا ارادہ ہے؟"

اس نے جواب دیا: "گورنمنٹ کالج میں سیکنڈ ایئر آرٹس کا طالب علم ہوں اور وکیل بننے کا ارادہ ہے۔" اس پر آپ مسکرائے اور فرمایا: "بھئی گورنمنٹ کالج والوں کی ہمت قابل داد ہے۔ سرکاری درسگاہ میں پڑھنے اور ان آسائشوں سے محروم ہونے کے باوجود جو اسلامیہ کالج یا علی گڑھ یونیورسٹی والوں کو حاصل ہیں، تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لے رہے ہیں۔ شاباش! رہا وکیل بننے کا سوال، تو میرے بچو! جن کا رجحان وکالت کی طرف ہے وہ تو خیر وکیل بنیں۔ ان کی ہمیں ضرورت پڑے گی۔ مگر یاد رکھو کہ پاکستان کو ابتدائی مراحل میں سائنس دانوں، تاجروں اور صنعتی صلاحیتوں کے حامل افراد کی سخت

ضرورت ہوگی۔ زندگی کے ان شعبوں کی طرف بھی توجہ ضروری ہے۔"

قیام پاکستان کا تعین ہوتے ہی قائد اعظمؒ نے بارہا اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ زیر تعلیم طالب علموں کو ابھی سے منظم کرنا شروع کر دیا جائے۔ بالکل اسی طرح جیسے مسلم لیگ منظم ہے تاکہ ابھی سے انہیں تحریک پاکستان کے پس منظر اور قومی مقاصد سے مکمل آگاہی بخشی جائے۔ تاکہ وہ بعد میں تعمیر پاکستان کے تقاضوں سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکیں!

حکیم آفتاب احمد قرشی

تحریک پاکستان اور طلباء

میں پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا عہدیدار تھا اور اپنی بساط کے مطابق تحریک پاکستان کے لئے طلباء کے پلیٹ فارم سے خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ اسلامیہ کالج لاہور جہاں میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، قائداعظم اور مسلم لیگ کا قلعہ بن چکا تھا۔ ہم سب طالب علم ملک و ملت کے لئے قربانی دینے کے جذبے سے سرشار ہو چکے تھے اور اپنی جان تک نچھاور کرنے کے لئے قائداعظم کے اشارۂ ابرو کے منتظر رہتے تھے۔

قائداعظم جب کبھی لاہور تشریف لاتے طلباء سے ضرور ملاقات کرتے اور اسلامیہ کالج بھی آتے۔ ۱۹۴۰ء کی وہ صبح میری زندگی کا حاصل ہے جب مجھے ان سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ قائداعظم اسی صبح کو تشریف لائے تھے۔ وہ کسی قدر تھکے ہوئے تھے مگر ان کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر تبسم کی کرن جگمگا رہی تھیں۔ انہوں نے اچکن زیب تن کر رکھی تھی۔ چاندی جیسے سپید بال ان کی عظمت اور بزرگی میں اضافہ کر رہے تھے۔

گفتگو زیادہ تر مسلم لیگ میں طلباء کے کردار کے بارے میں ہوئی۔ میں نے قائداعظم سے نوجوانوں کے لئے پیغام کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا "میرا پیغام ہر نوجوان کے لئے یہی ہے کہ تنظیم اور نظم و ضبط پر زور دو اور ہر قربانی کے لئے تیار ہو جاؤ۔ قوموں کی آزادی کے گلستان خون سے سینچے جاتے ہیں اور مسلمان قوم اس سے مستثنیٰ نہیں۔ آج ہماری قوم مصائب کا شکار ہے مگر اس میں قومی احساس پیدا ہو رہا ہے۔ ان شاء اللہ ہماری قوم ترقی کرے گی۔ سب سے اہم چیز قومی کردار ہے۔ نوجوانوں

کرداری کو دار پیدا کرنا چاہیے۔ ملازمت زندگی کا مقصد نہیں بلکہ تجارت میں بھی حصہ لینا۔" قائداعظم بڑے التفات سے گفتگو کر رہے تھے۔ میں ان دنوں اسلامیہ کالج کی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا صدر تھا۔ اسلامیہ کالج پنجاب میں تحریک پاکستان کا مرکز تھا۔ اس بنا پر قائداعظم کا خصوصی لطف و کرم ہمارے لئے وقف تھا۔

میں نے قائداعظم سے لارڈ ویول کے بارے میں استفسار کیا تو قائداعظم نے فرمایا "لارڈ ویول دیانت دار ہیں لیکن ہندوستان کے سیاسی معاملات کو سمجھنے کے لئے وقت کی ضرورت ہے۔ جو ویول صرف نہیں کرتے۔ ابتدا میں لارڈ ویول مسلمانوں کے نقطہ نگاہ سے آگاہ نہیں تھے لیکن اب وہ مسلمانوں کے موقف سے پوری طرح آگاہ ہیں۔"

قائداعظم نے سر سٹیفورڈ کرپس کے بارے میں کہا۔ "وہ ذہین انسان تھے دوسرے کے نقطہ نگاہ کو بہت جلد سمجھ لیتے تھے۔" قائداعظم نے اس موقع پر انکشاف کیا کہ "ایک بار کرپس اور میری ملاقات کے لئے ایک گھنٹہ کا وقت مقرر ہوا مگر پندرہ منٹ میں گفتگو مکمل ہو گئی۔ میں رخصت ہونے لگا تو کرپس نے کہا کہ مسٹر جناح تشریف رکھیے اگر آپ اس قدر جلدی چلے گئے تو ہندو اخبار ہنگامہ برپا کر دیں گے۔ آئیے بیٹھ کر کچھ باتیں کریں۔ کرپس نے کافی منگوائی اور ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔"

کرپس مشن کے وقت سر سٹیفورڈ کرپس نے قائداعظم سے مسلمانوں کا نقطہ نگاہ سن کر اپنی اسکیم میں ترمیم کر لی تھی۔

مرکزی اور صوبائی انتخابات کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا کہ "مسلم عوام نے اپنا فیصلہ پاکستان کے حق میں دے دیا ہے۔ انتخابات پاکستان کی بنیاد پر لڑے گئے تھے۔ اب دنیا بھر میں یہ حقیقت آشکار ہو گئی ہے کہ برصغیر کے مسلمان پاکستان کے حق میں ہیں۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی غیر معمولی کامیابی طلباء کی رہین منت ہے۔"

قائداعظم نے طلباء کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ "طلبا نے اخلاص و ایثار

ے جلسہ پاکستان کو اولین درجہ سر کر لیا ہے۔ قائد اعظم نے فرمایا کہ "پنجاب کے مسلمانوں
نے نہ صرف پنجاب بلکہ پورے برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں کی عدیم النظیر خدمت
سرانجام دی ہے۔ پنجاب میں انتخابات میں مسلم عوام پر ظلم و ستم کی ذمہ داری صوبے کی افسر
شاہی پہ ہے جو کہ برطانوی سامراج کی آلۂ کار ہے۔"

میں نے قائد اعظم سے اسلامیہ کالج لاہور کے جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت کی
درخواست کی۔ وہ ۱۹۴۱ء میں بھی اسلامیہ کالج کے جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت
کر چکے تھے۔ اس بنا پر بعض دوستوں کا خیال تھا کہ وہ اس درخواست کو قبول نہیں
کریں گے مگر قائد اعظم نے تقسیم اسناد کی دوسری بار صدارت کی اور طلبہ کو نہایت
بیش قیمت نصائح سے نوازا۔ اس تاریخی تقریب میں انہوں نے سید قاسم رضوی
(مرحوم) اور مجھے تحریک پاکستان میں قومی خدمات سرانجام دینے پر خصوصی
اسناد سے نوازا۔ یہ سند آج بھی میرے پاس موجود ہے اور میری زندگی کا نہایت
قیمتی سرمایہ ہے۔

فدا محمد خان

انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف سینہ سپر

قائداعظمؒ نے ۱۹۳۴ء میں لندن سے واپس آکر مسلم لیگ کو منظم کرکے
مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا کام شروع کیا۔ پھر ۱۹۳۷ء کے انتخابات
منعقد ہوئے اور جہاں جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی وہاں کانگریس نے حکومت
بنائی۔ ان وزارتوں نے مسلمانوں پر مظالم ڈھائے ان کے نتیجے میں ۱۹۳۷ء کے بعد
مسلم لیگ ابھرنے لگی۔ یہاں تک کہ قائداعظمؒ کو اعلان کرنا پڑا کہ ہندوستان میں
نہ صرف ہندو اور انگریز دو فریق ہیں بلکہ ایک تیسرا فریق بھی ہے اور وہ مسلمانوں کا
ہے۔ اس وقت نہ صرف ہندوؤں نے اس دعوے کا مذاق اڑایا بلکہ خود مسلمانوں کے
بہت سے لیڈروں نے بھی اسے قابل توجہ نہ سمجھا۔ لیکن قائداعظمؒ کے عزم صمیم بصیرت
اور فراست کی بدولت مسلمانوں کا یہ مختصر کارواں آہستہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ
آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی منزل مراد کو پا لیا۔

قائداعظمؒ کسی قیمت پر خریدے نہیں جا سکتے تھے۔ وہ اپنے سامنے جس
نظریے کو رکھ کر آگے بڑھتے تھے اس سے کسی قیمت پر ہٹنا نہیں جانتے تھے۔
انہوں نے بالآخر ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو جو نظریہ مسلمانوں کو دیا اور جس کا نام بعد
میں نظریۂ پاکستان رکھا گیا وہ ایک ایسی مثال ہے جو کہ دنیا میں اس سے پہلے

کبھی نہیں ملی۔ پھر نہایت مختصر دور میں انہوں نے نعرۂ پاکستان کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

قائد اعظمؒ کو مجھے بہت نزدیک سے بھی دیکھنے کا فخر بھی حاصل ہوا ہے جب وہ ۱۹۴۰ء میں پشاور تشریف لائے۔ اور جب میں ان کے ہمراہ اس وقت کے ہندوستان کی سرحد یعنی طورخم گیا اور طورخم کے مقام پر جب انہیں یہ بتایا گیا کہ اس سے آگے افغان اپنے ملک کی سرزمین کو "خاک پاک" کہتے ہیں تو انہوں نے بلا تامل فرمایا کہ گھبرایئے نہیں آپ کا ملک بھی "خاک پاک" ہونے والا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا یقین اس قدر مضبوط تھا کہ وہ ۱۹۴۰ء میں محسوس کرتے تھے کہ مسلمان اپنے خطے میں آزاد ہو کر رہیں گے۔ چنانچہ وہی ہوا کہ ۱۹۴۷ء میں ہی اللہ تعالیٰ نے ہمیں پاکستان دے دیا اور یہ بلا شبہ قائد اعظمؒ کے مرہون منت ہے۔

سوانحی خاکے

اصفہانی، مرزا ابوالحسن (۱۹۰۲-۱۹۸۰) مسلم لیگ کے رہنما۔ رکن بنگال اسمبلی ۱۹۴۶ء اور ۱۹۳۷ء، رکن دستور ساز اسمبلی پاکستان ۱۹۴۷ء، وزیر صنعت و تجارت ۱۹۵۴-۵۵ء، سفیر برائے امریکہ و افغانستان، ہائی کمشنر برائے برطانیہ، رکن مجلس منتظمہ قائداعظم اکادمی۔

اکبر، قاضی محمد (۱۹۱۲ء-۱۹۶۹ء) رکن سندھ اسمبلی ۱۹۴۶-۱۹۵۰ء، وزیر تعلیم و خزانہ سندھ ۱۹۵۳-۱۹۵۵ء، چیف ایڈیٹر ڈیلی سندھ نیوز حیدرآباد

اکرام اللہ، بیگم شائستہ (پیدائش ۱۹۱۵ء) ڈگریاں۔ کلکتہ، لندن یونیورسٹی۔ آل انڈیا مسلم ویمن اسٹوڈنٹس فیڈریشن۔ رکن مسلم ویمنز سب کمیٹی۔ آل انڈیا مسلم لیگ۔ رکن پاکستان وفد برائے سلامتی کونسل، اقوام متحدہ۔ رکن ایگزیکٹو کمیٹی قائداعظم اکادمی ۱۹۷۶ء-۱۹۸۰ء

امام، سید حسین (پیدائش ۱۸۹۷ء) تعلیم پٹنہ و انگلستان، شرکت تحریک خلافت ۱۹۲۱ء انڈین نیشنل کانگریس گیا اجلاس (۱۹۲۲ء) رکن کونسل آف اسٹیٹ ۱۹۳۰-۱۹۴۷ء، صدر کونسل آف اسٹیٹ ۱۹۴۷-۱۹۴۳ء، صدر بہار صوبائی مسلم لیگ ۱۹۳۷-۱۹۴۷ء، رکن ورکنگ کمیٹی، آل انڈیا مسلم لیگ، رکن مرکزی پارلیمانی بورڈ۔ آل انڈیا مسلم لیگ۔

امیر الدین، میاں (پیدائش ۱۸۹۰ء) تعلیم گورنمنٹ کالج لاہور، میئر لاہور میونسپلٹی ۱۹۳۴ء۔ رکن پنجاب اسمبلی ۱۹۳۱-۱۹۳۷ء، سیکرٹری مالیات پنجاب مسلم لیگ ۱۹۳۸-۱۹۴۶ء

رکن پاکستان دستور ساز اسمبلی ۱۹۵۰ء۔

انصاری، مولانا ظفر احمد۔ اسسٹنٹ سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ۔ رکن قومی اسمبلی پاکستان۔

پیرزادہ، سید شریف الدین۔ پرسنل سیکرٹری قائد اعظم ۱۹۴۱ء-۱۹۴۴ء۔ سینیئر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان۔ وزیر قانون، وزیر خارجہ۔ اٹارنی جنرل حکومت پاکستان ۱۹۷۷ء-۱۹۸۰ء۔ چیئرمین سوانح کمیٹی، قائد اعظم اکادمی ۱۹۷۸ء۔

تھانوی، مولانا احتشام الحق (۱۹۱۵ء-۱۹۸۰ء) پیدائش (تاؤ) تعلیم دارالعلوم دیوبند۔ امام، سیکرٹری مسجد فتحپوری دہلی ۱۹۴۳ء۔ امام و خطیب جامع مسجد جیکب لائن کراچی ۱۹۴۷ء-۱۹۸۰ء۔

جعفر، احمد ای۔ ایچ۔ پیدائش ۱۹۰۹ء۔ تعلیم ڈی۔ جے کالج کراچی۔ رکن مرکزی اسمبلی، دہلی ۱۹۴۲ء-۱۹۴۵ء۔ صدر پاکستان اور ایشیا ایسوسی ایشن۔

حسین، سید عابد۔ حکومت ہند کے سیکرٹریٹ کی ملازمت کے دوران دہلی میں قائد اعظم کے پرسنل سیکرٹری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں (وزارت اطلاعات پاکستان)

حلیم، پروفیسر اے۔ بی۔ اے۔ (۱۸۹۷ء-۱۹۷۵ء) تعلیم علی گڑھ یونیورسٹی، پروفیسر تاریخ، پرو وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی، رکن یوپی لیجسلیٹو اسمبلی۔ وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی۔

خان، ابوالہاشم۔ رکن بنگال لیجسلیٹو اسمبلی ۱۹۳۶ء۔ بنگال مسلم لیگ کے رہنما۔

خان، پیر بخش (پیدائش ۱۹۰۲ء) تعلیم پشاور اور علی گڑھ۔ شرکت تحریک خلافت، صوبہ سرحد کے ممتاز وکیل اور مسلم لیگ کے رکن۔

خان، سر محمد یامین (پیدائش ۱۸۸۸ء) تعلیم میرٹھ کالج، علی گڑھ یونیورسٹی۔ وکیل۔ چیئرمین میونسپل بورڈ میرٹھ ۱۹۱۹ء-۱۹۲۱ء۔ رکن مرکزی اسمبلی ۱۹۲۰ء-۱۹۲۳ء تا ۱۹۴۵ء۔ سیکرٹری مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی، مرکزی اسمبلی۔ نائب صدر مرکزی اسمبلی۔

خان، طورعلی۔ قائد اعظم کا ملازم اور چوکیدار

خان، سر محمد ظفر اللہ (پیدائش ۱۸۹۳ء) تعلیم گورنمنٹ کالج لاہور، کنگس کالج۔

لنکنز ان۔ لندن۔ ایڈووکیٹ لاہور ہائی کورٹ ۱۹۱۶ – ۱۹۳۵ء، جج فیڈرل کورٹ آف انڈیا ۱۹۴۱ – ۱۹۴۷ء۔ وزیر خارجہ پاکستان ۱۹۴۷ – ۱۹۵۴ء۔ جج بین الاقوامی عدالت انصاف۔

خان۔ فدا محمد راولپنڈی کے ممتاز وکیل، مسلم لیگ کے مقامی رہنما۔

خان، لیاقت علی خان (۱۸۹۶ – ۱۹۵۱ء) تعلیم: علی گڑھ یونیورسٹی۔ الٰہ آباد یونیورسٹی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی۔ رکن یوپی لیجسلیٹو کونسل ۱۹۲۶ – ۱۹۴۰ء۔ رکن انڈین لیجسلیٹو اسمبلی ۱۹۴۰ – ۱۹۴۷ء۔ ڈپٹی لیڈر مسلم لیگ اسمبلی پارٹی ۱۹۴۳ – ۱۹۴۷ء۔ جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ۔ ۱۹۳۶ – ۱۹۴۷ء۔ رکن عبوری حکومت ۱۹۴۶ء، جنرل سیکرٹری۔ آل انڈیا مسلم لیگ ۱۹۳۶ – ۱۹۴۷ء۔ رکن عبوری حکومت ۱۹۴۶ – ۱۹۴۷ء۔ وزیر اعظم پاکستان ۱۹۴۷ – ۱۹۵۱ء۔

خان۔ مولانا محمد اکرم (۱۸۶۸ – ۱۹۶۸ء) صحافی اور بنگال کے مسلمان رہنما، صدر بنگال مسلم لیگ، ایڈیٹر "آزاد" کلکتہ۔ ڈھاکہ۔

خان۔ نواب صدیق علی (وفات ۱۹۷۴ء) سی پی۔ برار مسلم لیگ کے صدر سیاست میں نمایاں، رکن دستور ساز اسمبلی ۱۹۴۷ء، سالار اعلیٰ مسلم لیگ نیشنل گارڈز۔

خلیق الزمان، چودھری (۱۸۸۹ – ۱۹۷۳ء) تعلیم علی گڑھ، رکن کانگریس ۱۹۱۶ء۔ جائنٹ سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ ۱۹۱۶ء۔ لیڈر مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ یوپی ۱۹۳۷ء۔ رکن ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم ۱۹۳۸ء۔ آرگنائزر آل پاکستان مسلم لیگ ۱۹۴۷ء۔ گورنر مشرقی پاکستان ۱۹۵۳ء۔ سفیر برائے انڈونیشیا اور فلپائن۔ صدر کنونشن مسلم لیگ۔

ربانی۔ محبوب، کیپٹن اے۔ ڈی۔ سی قائد اعظم محمد علی جناح۔

رحمان، جسٹس ایس۔ اے (۱۹۰۳ – ۱۹۹۰ء) تعلیم اسلامیہ کالج لاہور، گورنمنٹ کالج لاہور۔ انڈین سول سروس کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۷ء سب ڈویژنل مجسٹریٹ۔ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج۔ جج لاہور ہائی کورٹ ۱۹۴۶ء، سیکرٹری قانون حکومت پنجاب ۱۹۴۳ء۔ رکن بنگال باؤنڈری کمیشن ۱۹۴۷ء۔ چیف جسٹس مغربی پاکستان ہائی کورٹ ۱۹۵۴ء، چیف جسٹس سپریم

بلوچستان۔ رکن پاکستان وفد برائے جنرل اسمبلی اقوام متحدہ ۱۹۵۰۔ مشیر حکومت پاکستان برائے بلوچستان ۱۹۴۹۔ سفیر پاکستان برائے برازیل۔

فخر ماتری (۱۹۰۶-۱۹۷۷) ممتاز صحافی اور مقرر۔ کاٹھیاواڑ بھارت آل انڈیا مسلم لیگ کے رکن اور رہنما۔ ایڈیٹر ہفت روزہ وحدت (گجراتی) بمبئی ۱۹۳۰-۱۹۴۰) بمبئی سے جمہوریت ۱۹۴۰-۴۷، ایڈیٹر روزنامہ وحدت (گجراتی) کراچی ۱۹۴۸-۱۹۶۲۔ ایڈیٹر ڈیلی لیڈر کراچی ۱۹۵۰-۱۹۶۲۔ ایڈیٹر روزنامہ حریت کراچی ۱۹۶۲-۱۹۷۲۔

قادری، پروفیسر افضال حسین (۱۹۰۴-۱۹۷۴) علی گڑھ یونیورسٹی، تعلیم علی گڑھ یونیورسٹی۔ کیمبرج۔ تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا۔ رئیس کلیہ سائنس جامعہ کراچی۔ صدر سائنٹفک سوسائٹی آف پاکستان۔

قریشی، حکیم آفتاب احمد (۱۹۳۶ء-۱۹۸۴ء) پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر اور تحریک پاکستان کے بے لوث کارکن۔

قریشی، ڈاکٹر اشتیاق حسین (۱۹۰۳-۱۹۸۱) تعلیم الہ آباد، دہلی، سنٹ جیمس، کیمبرج۔ لیکچرر سینٹ اسٹیفن کالج دہلی ۱۹۲۸۔ ریڈر دہلی یونیورسٹی ۱۹۴۰۔ رئیس کلیہ فنون دہلی یونیورسٹی ۱۹۴۴ رکن مسلم لیگ ایجوکیشن کمیٹی۔ رکن مرکزی اسمبلی انڈیا۔ رکن پاکستان دستور ساز اسمبلی۔ وزیر حکومت برائے مہاجرین و آبادکاری ۱۹۵۰۔ وزیر اطلاعات نشریات ۱۹۵۱۔ وزیر تعلیم ۱۹۵۲۔ پروفیسر کولمبیا یونیورسٹی نیویارک ۱۹۵۵-۱۹۶۰۔ وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی ۱۹۶۲ رکن مورخ کمیٹی قائد اعظم اکادمی ۱۹۷۷ چیئرمین مقتدرہ قومی زبان ۱۹۷۹-۱۹۸۰

کریم بخش زیارت میں قائد اعظم کے خانساماں

کھوڑو، محمد ایوب (۱۹۰۱-۱۹۸۰) رکن بمبئی لیجسلیٹو کونسل ۱۹۲۳-۱۹۳۶ رکن ایڈوائزری کونسل، گورنر سندھ ۱۹۳۶-۱۹۳۷۔ رکن اور قائد حزب اختلاف سندھ اسمبلی ۱۹۳۹-۱۹۴۲۔ وزیر محصولات سندھ ۱۹۴۲-۱۹۴۷۔ وزیر اعلیٰ سندھ ۱۹۴۷۔

۱۹۵۱ء صدر سندھ مسلم لیگ ۱۹۴۸ء فنانشل حکومت پاکستان ۱۹۵۸ء۔

محمد علی چوہدری (۱۹۰۵ء-۱۹۸۰ء) تعلیم پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ اکاؤنٹنٹ جنرل بہاولپور ریاست ۱۹۳۲ء سیکرٹری جنرل حکومت پاکستان ۱۹۴۷ء-۱۹۵۱ء۔ وزیر اعظم پاکستان ۱۹۵۵ء-۱۹۵۶ء۔ صدر نظام اسلام پارٹی۔

مفتی عبدالرؤف شباب پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے رہنما اور تحریک پاکستان کے ممتاز کارکن

کیمبل جانسن۔ ایلن ۔ (پیدائش ۱۹۱۳ء) تعلیم ویسٹ منسٹر کرائسٹ چرچ آکسفورڈ۔ پرائیویٹ سیکرٹری۔ سر آرچی بالڈ سنکلیر ۱۹۳۷ء-۱۹۴۰ء۔ آفیسر انچارج، انٹر الائیڈ ریکارڈز سیکشن۔ ساؤتھ ایسٹ ایشیا کمانڈ۔ پریس اتاشی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن۔ ۱۹۴۷ء-۱۹۴۸ء۔ سابق صدر انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ریلیشنز۔

ملک (ڈاکٹر) عمر حیات (پیدائش ۱۹۰۳ء) تعلیم علی گڑھ۔ کیمبرج۔ گوٹنجن۔ پروفیسر اور پرنسپل اسلامیہ کالج پشاور ۱۹۳۷ء-۱۹۴۱ء۔ پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور ۱۹۴۳ء-۱۹۴۴ء۔ صدر شعبہ ریاضیات پنجاب یونیورسٹی رکن پاکستان دستور ساز اسمبلی ۱۹۴۷ء-۱۹۵۴ء۔ سفیر پاکستان برائے انڈونیشیا۔

مشیاد۔ محمد حنیف۔ بمبئی کے مسلمان تاجر مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور آل انڈیا مسلم لیگ کے کارکن۔

ناصر انصاری (پیدائش ۱۹۱۱ء) آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے۔ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن۔ راولپنڈی سے ریٹائر ہوئے۔

نورالامین (۱۸۹۷ء-۱۹۷۴ء) تعلیم کلکتہ یونیورسٹی۔ وکیل میمن سنگھ ۱۹۲۴ء-۱۹۴۵ء۔ رکن بنگال لیجسلیٹو کونسل ۱۹۴۲ء۔ رکن بنگال لیجسلیٹو اسمبلی ۱۹۴۶ء۔ اسپیکر بنگال اسمبلی ۱۹۴۶ء-۱۹۴۷ء۔ وزیر اعلیٰ مشرقی پاکستان ۱۹۴۸ء-۱۹۵۴ء

ہارون، محمود اے۔ اے ڈی سی۔ قائد اعظم محمد علی جناح ۱۹۴۸ء۔ رکن مسلم لیگ کونسل ۱۹۴۲ء۔ صدر کراچی صوبائی مسلم لیگ ۱۹۴۳ء۔ صدر کراچی وار ورکرز یونین ۱۹۴۳ء،

رکن سندھ قانون ساز اسمبلی ۱۹۴۹ء-۱۹۵۰ء رکن مغربی پاکستان اسمبلی ۱۹۵۲ء-۱۹۵۵ء
میئر کراچی ۱۹۵۳-۱۹۵۴) رکن قومی اسمبلی ۱۹۶۵ء، وزیر صحت و سماجی بہبود۔
صوبہ سندھ ۱۹۶۵ء۔ وفات ۱۹۵۸ء سے صاحب تک (۱۹۸۳)
نور الصباح بیگم (۱۹۰۸-۱۹۷۸) خلافت تحریک میں حصہ لیا۔ ۱۹۳۱ء مسلم لیگ
میں شمولیت ۱۹۴۳ء سیکرٹری بلدیاتی حصہ وائس صدر صوبائی خواتین مسلم لیگ۔ رکن
سب کمیٹی برائے خواتین آل انڈیا مسلم لیگ۔ رکن ورکنگ کمیٹی۔ رکن سندھ صوبائی
مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی ۱۹۴۶-۱۹۵۶۔

اشاریہ